انجمن ترقی اردو کا المیہ

بابائے اردو مولوی عبدالحق

(مطبوعہ ۱۹۵۸ء)

حرفے چند

جمیل الدین عالی

(۲۰۰۲ء)

انجمن ترقی اردو پاکستان

انجمن ترقی اردو کا المیہ

بابائے اردو مولوی عبدالحق

(مطبوعہ ۱۹۵۸ء)

حرفے چند

جمیل الدین عالی

(۲۰۰۲ء)

انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈی۔۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال،

کراچی۔۷۵۳۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل الدین عالیؔ
معتمد اعزازی

حرفِ چند

وقت نے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کو جو مقام عطا کر دیا ہے اس کے پیش نظر اس کتاب کا بیشتر حصہ نا قابل یقین لگتا ہے۔ "ہائیں، کیا مولوی صاحب کے ساتھ یہ بدسلوکی بھی ہو سکتی تھی، وہ بھی ان کے بنائے ہوئے ادارے میں ان کے اپنے نامزد شرکائے کار کے ہاتھوں؟" مگر اتفاق، یا بدنصیبی کہ یہ سب ہوا، یہ تحریر تمام تر خود مولوی صاحب ہی کی ہے یعنی یہ سب ان پر گزری۔ اس طرح کہ انھیں یہ سب لکھنا اور چھاپنا بھی پڑا۔ مجھے یہ انجمن اور مولوی صاحب کے مسلسل، بے مثال، کارناموں کے سیاق وسباق میں ایک بڑا ہی حیرت انگیز درد آمیز متن لگتا رہا ہے۔ چوالیس برس پُرانا ہے، اب بالکل نایاب، لیکن اب کہ انجمن اپنی صد سالہ سالگرہ (تین جنوری ۲۰۰۳) کے قریب پہنچ رہی ہے اسے ایک بار پھر شائع ہو کر نئے ذہنوں کے سامنے (دوبارہ) آجانا چاہیے۔ اس سے ایک، خواہ افسوسناک، اندازہ یہ بھی ہوگا کہ ایسی بنی بنائی اور محترم اور عمر رسیدہ شخصیت جیسی کہ مولوی صاحب ۱۹۵۸ء میں تھے (سال پیدائش ۱۸۷۰ء) صرف اور صرف ایک عظیم قومی کام کی خاطر کن کن کے ہاتھوں کن کن عذابوں سے گزرنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ لیکن یہ حوالہ ابھی ذہنی عذابوں کا ہے۔ اس کتابچے کی اشاعت کے بعد ان پر جسمانی عذابوں میں عجیب وغریب اضافوں کا ایک اور سلسلہ جاری کیا گیا تھا جس کی مختصر داستان راقم الحروف جو اِن کا ایک عینی شاہد اور اس دور میں مولوی صاحب کا نہایت ناچیز خادم بھی رہا اگلی

سطروں میں قلم بند کرے گا۔ اب اولاً اسی کتابچے سے ایک اقتباس:

''جب میں نے ڈاکٹر محمود حسین خان سے اس پر احتجاج کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ بھی رہے گا اور وہ بھی رہے گا حالانکہ دو چوکیداروں کی مطلق ضرورت نہ تھی، بلاوجہ انجمن کا روپیہ ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ لیکن حکیم احسن کے حکم کو کیسے ٹال سکتے تھے۔ درحقیقت اس نئے شخص کا تقرر چوکیداری پر نہیں بلکہ جاسوسی کی خدمت پر کیا گیا تھا۔ یہ لوگوں کو میرے پاس آنے سے روکتا ہے اور جو اس کے روکنے کی پروا نہیں کرتے ان کی رپورٹ حکیم صاحب کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ میرے ساتھ کام کرنے والے یا میرے خاص ہمدرد میرے پاس نہیں آنے پاتے، انھیں زدوکوب کرنے کی دھمکی دی جاتی اور وہ ڈر کر انجمن میں قدم نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے ایک شریف آدمی غنڈوں سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انجمن کے کارکنوں کو مجھ سے ملنے کی ممانعت ہے۔ وہ حکیم صاحب کے عتاب سے ڈرتے ہیں۔ چند اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بلا کسی معاوضہ کے از راہ ایثار لڑکیوں کو یونی ورسٹی امتحانات کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ انھیں پڑھانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی تھی، میرے پاس آئیں تو میں نے انھیں نیچے کی گیلری میں پڑھانے کی اجازت دے دی۔ اس کے متعلق حکیم صاحب نے جو شرمناک کارروائی کی اس کی کیفیت آپ آیندہ اوراق میں پڑھیں گے۔ یہ حرکت محض مجھے زک دینے کے لیے کی گئی تھی۔ ملازمین کو ڈرا دھمکا کر میرے خلاف قابل الزام بیانات

لکھوائے جاتے ہیں۔ میرا فون ٹیپ کیا جاتا ہے، میں کہیں جاتا ہوں تو میرے پیچھے جاسوس لگے رہتے ہیں۔ میرے خط سنسر کیے جاتے ہیں میرے کتب خانے پر پانچ چھ حملے کیے گئے تاکہ کچھ کتابیں اڑا لیں اور مجلس نظما میں پیش کریں اور ثابت کریں کہ بازار میں بکتی ہوئی پکڑی گئیں۔ کتب خانے کا انتظام ناقص ہے، حکیم صاحب کے حوالے کر دیا جائے، ان ذلیل حرکات کی تفصیل آپ آیندہ اوراق میں پائیں گے۔ مجھے منصب صدارت سے خارج کر کے سرپرستوں کی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ حکیم صاحب کا یہ ادّعا تھا کہ ہم عبدالحق کو اس قدر اذیتیں پہنچائیں گے کہ وہ چند مہینے میں ختم ہو جائے گا۔ پھر ہم اس کے کتب خانوں اور انجمن پر قبضہ کرلیں گے۔

یہ سب حرکات اس منصوبے کے پورا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ اس شخص کی جسارت یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ اپنے سازشی رفقا کی حمایت اور اکثریت کے بل پر ایسی قراردادیں مغالطہ یا دھوکا دے کر منظور کرالی جاتی ہیں جو خلاف دستور ہیں اور معتمد ڈاکٹر محمود حسین صاحب چوں تک نہیں کرتے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور یہ بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے خلاف دستور انجمن بلاضرورت نئی اسامیاں قائم کر کے اپنے مطلب کے دو شخصوں کو انجمن میں ملازم رکھ لیا ہے۔ ان میں سے ایک صفی الحسن زیدی ہے جس کی تنخواہ پونے تین سو روپے ہے، اور دوسرا عبدالمجید جس کی تنخواہ

ڈیڑھ سو روپے ہے۔ یہ دونوں حکیم صاحب کے مطب میں کام کرتے ہیں اور تنخواہ انجمن سے پاتے ہیں۔ برائے نام ایک پھیرا انجمن میں بھی لگا جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے جھوٹوں بھی کبھی یہ نہ پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں، کیوں رکھے گئے ہیں۔ان کا کیا کام ہے۔کس کی منظوری سے ان کا تقرر کیا گیا ہے۔حکیم صاحب کی دیدہ دلیری دیکھیے کہ وہ مولوی عبدالعلی خان صاحب مددگار معتمد کو حکم دیتے ہیں کہ مولوی صاحب کے تمام خطوط کھول کر پڑھا کرو اور ان میں جو کچھ لکھا ہو وہ ہم سے بیان کیا کرو۔ جب مددگار صاحب نے اس حکم کی تعمیل سے معذوری ظاہر کی تو انھیں معلّم اخلاق جناب میجر آفتاب حسن صاحب ایم ایس سی (علیگ) بی ایس سی (لندن) پرنسپل انجمن ترقی اردو کالج کی خدمت میں بھیجا۔ جناب پرنسپل صاحب نے ہدایت فرمائی کہ حکیم صاحب کے حکم کی تعمیل کرو اور خط کھول کر پڑھا کرو، اس میں کوئی ہرج نہیں۔ مددگار صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے علم میں یہ سب کچھ ہے لیکن انھیں جرات نہیں کہ وہ حکیم صاحب سے اس خلاف اخلاق خلاف قانون مجرمانہ فعل کی نسبت باز پرس کریں۔ان کے باز پرس نہ کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود اس میں شریک ہیں اور اعانت جرم کر رہے ہیں۔کالج کے فاضل پرنسپل، یونی ورسٹی کے نامور پروفیسر اور انجمن ترقی اردو کے معتمد اور سابق میئر کراچی کارپوریشن، حال شریک معتمد انجمن و معتمد انجمن ترقی اردو

کالج کے یہ اخلاق ہوں تو اس کالج اُس یونی ورسٹی اور اس انجمن کے حق میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدا ان کے حال پر رحم فرمائے۔

اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں انجمن میں نہ تو کوئی نئی علمی یا ادبی کتاب شائع ہوئی اور نہ کسی تحقیقی کام کی کوئی صورت پیدا کی گئی اور نہ آیندہ کے لیے کوئی علمی ادبی پروگرام تجویز کیا گیا۔ معاملات میں پے در پے الجھنیں بڑھتی گئیں۔ اخباروں میں ان حالات پر سخت نکتہ چینی اور اعتراضات کیے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے فرار میں اپنی سلامتی دیکھی اور ۲۸/جون کو استعفیٰ بھیج دیا اور ۱۱/جولائی کو اپنے عہدے کا چارج شریک معتمد کو دے دیا۔ یہ استعفیٰ مجلس نظما منعقدہ ۹/اگست ۵۸ء میں پیش ہوا مجلس نے ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی اور ایک وفد بھی ان کی خدمت میں اسی غرض سے حاضر ہوا۔ اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ انھوں نے استعفیٰ واپس لیا یا نہیں دفتر میں کسی کو معلوم نہیں کہ معتمد کوئی ہے بھی یا نہیں، سارا کام خدا کے بھروسے پر چل رہا ہے۔

یہ حالت بہت نازک اور خطرناک ہے، اسے دیکھ کر مجھے سخت رنج اور صدمہ ہے۔ اس تھوڑے سے عرصے میں انجمن کا انحطاط اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ اگر چندے یہی حالت رہی تو شاید اسے وہ روز بد دیکھنا پڑے جس کا اندیشہ ہے میں نے تقریباً پچاس سال تک اس انجمن کے بنانے، ترقی دینے، انجمن کے مقاصد پورا کرنے اور اردو

کے وقار کو بڑھانے کے لیے ہر قسم کی محنت و مشقت اور جدو جہد کی اور اپنا دل و دماغ اور سرمایہ اس کی نذر کر دیا۔ میں اپنی زندگی میں اسے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر میں خاموشی سے ایک تماشائی کی طرح یہ سب کچھ دیکھتا رہا تو مجھ سے زیادہ قابل ملامت کوئی شخص نہیں ہوسکتا۔ اسے ہلاکت سے بچانا دردمندانِ اردو کا فرض ہے، ورنہ میں اس زندگی پر موت کو ترجیح دوں گا''۔

معرفت نیست دریں قوم خدایا مددے
کہ برم گوہر خودرا بہ خریدار دگر

عبدالحق

جسمانی اذیتیں

جیسا کہ عرض کیا گیا، راقم الحروف ان جسمانی اذیتوں کے دور کا عینی شاہد ہے اور بھی ہوں گے۔ مثلاً ابن انشا اور حکیم اسرار احمد کریوی (مولوی صاحب کے ایک معاون جن سے میں زیادہ واقف نہیں رہا) برادرم مشفق خواجہ۔ اول الذکر دونوں جا چکے ہیں اور سچ کہ مجھے کسی گواہ کی ضرورت بھی نہیں۔ میرا مقصد کسی پر الزام تراشی نہیں ایک واقعی عظیم شخصیت، ایک خالص رضا کار اردو کے ساتھ ''اپنوں'' ہی کے ہاتھوں ہونے والی نا قابل یقین، زیادتیوں کو ریکارڈ پر لانا ہے اس لیے اس بیان میں کوئی کم وکاست نہیں۔ میں کسی کا نام بھی نہیں لے رہا۔ مجھے کسی کو سزا نہیں دلوانی۔ ایک قومی المیہ بیان کرنا ہے۔ شاید آج کے پیشہ ور آزاردہ بدگو اور اگلی نسل کے کارکن کچھ سبق لیں...

مولوی صاحب سے میری نیازمندی میرے لڑکپن سے مگر تفاوت عمر کے سبب واجبی سی تھی۔ وہ میرے ایک سگے پھوپھی زاد بھائی نواب منظور جنگ اول تعلقدار حیدر آباد (دکن) کے ایک طرح دوست اور مربیّ تھے۔ میرے چچازاد بھائی اور خسر صاحبزادہ مرزا صمصام الدین فیروز

لوہاروی بھی، جو نواب منظور جنگ کے ہم عمر تھے، مولوی صاحب سے ارادت رکھتے تھے۔ میرے رشتے کے چچا نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی، مولوی صاحب سے چند برس بڑے تھے مگر انھیں حیدر آباد سے جانتے تھے اور جب سے مولوی صاحب انجمن کا صدر دفتر دہلی لے آئے تھے ہر چوتھے پانچویں دن بوقت سہ پہر (بہ سبب بیماری) رکشا پر سوار ہو کر دریا گنج (دہلی) دفتر انجمن میں بھی جاتے (یہ سہ پہر کی ہوا خوری ان کے معمولات میں شامل تھی) وہاں عموماً (دو معاونین انجمن پھوپھی زاد بھائی سید ہاشمی فرید آبادی اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی موجود ہوتے۔ کبھی کبھی مولوی صاحب کے دوسرے ملنے والے بھی) میں چچا جان کے ساتھ ہوتا۔ کسی قدر فاصلے پر بیٹھ کر اُن کی باتیں سنتا۔ کبھی کبھار نیچے جا کر انجمن کے کتب خانے میں بھی بیٹھ جاتا جب وہ چلنے لگتے واپس آجاتا... یہ سب کچھ خصوصیت طلبی نہیں صرف مولوی صاحب سے اپنی پرانی نیاز مندی کا حوالہ ہے۔ پاکستان میں اولین دو تین برس تو ان کی خدمت میں حاضری بھی واجبی واجبی سی رہی۔ اپنی اور اعزا و احبا کی ''مہاجریت''، اس کی مختلف منزلیں، نوکری، ادب میں شاعری سے زیادہ دلچسپی مقامی حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین کی ''مصروفیات''، تفاوت عمر و مدارج بھی، بس گاہے گاہے سلام کو حاضر ہو جاتا۔ اکثر شام کو اسی شار دامند روالے مکان انجمن میں، کبھی سہ پہر، کبھی شام، عموماً کئی حاضر باش ہوتے۔ بیرون کراچی سے آنے والے مداح، کارکن اور زائرین بھی عموماً شام کو آتے...

اس کتابچے کی اشاعت سے پہلے کبھی کبھی ابن انشا کی زبانی معلوم ہوتا کہ مولوی صاحب کو پریشان کیا جا رہا ہے اور بس۔ ابن انشا بھی کوئی باقاعدہ روداد تو سناتا نہیں تھا۔ ان کا راست شاگرد بھی نہیں تھا، ہاں ایک وقت اردو کالج میں داخلے کے ذریعے۔ (کالج کے بالکل سامنے ہی مولوی صاحب دفتر انجمن سے اوپر ایک کمرے میں رہتے تھے) ان کی خدمت میں میری نسبت کہیں زیادہ اوسط سے حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی طبعی بذلہ سنجی اور ذہانت کے سبب بھی ان کے پسندیدہ نوجوان ادیبوں میں شامل ہو گیا تھا۔ خود بھی ان سے عقیدت، محبت کی حد تک رکھتا تھا۔

اس کتابچے کی اشاعت سے پہلے غالباً ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۶ء میں جب میرے خسر لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ سید ہاشمی صاحب (جو لاہور چلے گئے تھے اور کسی کام سے کراچی آئے ہوئے تھے) ان سے ملنے میرے گھر آئے اور مجھے حکم دیا کہ مولوی صاحب کو، انھیں اور پیر حسام الدین راشدی کو اپنے گھر عشائیے پر مدعو کروں تا کہ کچھ خاص باتیں ہو سکیں۔ آنے سے پہلے مولوی صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا کہ کم از کم ایک سو روپے کا چندہ انجمن کے لیے حاصل کرلوں گا (اس وقت میں انکم ٹیکس افسر تھا)۔ اس عشائیے پر میرے سامنے پہلی بار انھوں نے انجمن اور کالج کے حوالے سے اپنی مشکلات و شکایات سنائیں۔ پیر صاحب کی تعریف کی اور ہاشمی صاحب سے شکوہ کہ (تقریباً) پنجاہ سالہ رفاقت کے باوجود انھیں چھوڑ کر اپنے گھر (لاہور) چلے گئے ہیں۔ سید ہاشمی صاحب نے اپنی وجوہ دہرائیں (مولوی صاحب واقف بھی تھے) بزرگوں نے خوب بحث مباحثے کیے۔ میں اور ابن انشا چپ بیٹھے سنتے رہے۔ کہیں کہیں ابن انشا ان کا تکدّر دور کرنے کے لیے کوئی مزاحیہ فقرہ بول دیتا تھا...میں زیر عتاب آتا رہا۔ میں انجمن کے لیے کوئی معقول چندہ وغیرہ جمع نہیں کر سکا تھا اس وقت مولوی صاحب اپنے حالات کی وجہ سے ایسی کوئی تحریک بھی نہیں چلا رہے تھے...میں نہیں جانتا کہ اس محفل کا نتیجہ کیا نکلا۔ بس وقفے وقفے سے، حسب معمول سلام کو جاتا رہا۔ محسوس کیا کہ ان کا معیار مدارات (فواکہات کی پیش کش) کم ہوتا جاتا ہے، ان کی آمدنی بہت کم ہو رہی تھی۔

اس کتابچے کی اشاعت نے مولوی صاحب کے مخالفوں کو بہت برہم کر دیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کس کس نے جسمانی آزاردہی میں کتنا حصہ لیا۔ اتنا تاثر ضرور ریکارڈ پر لاؤں گا کہ میری دانست میں ڈاکٹر محمود حسین خاں اور ڈاکٹر معین الحق صاحبان کوئی رکیک حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے یقیناً مولوی صاحب کو کسی طرح کا جسمانی آزار دینے کی کوشش نہیں کی ہوگی میں انھیں، ڈاکٹر محمود حسین خاں کو نسبتاً زیادہ، جانتا تھا۔ معمولی سی نیازمندی ڈاکٹر حق سے بھی تھی۔ وہ اپنی کمزوریوں کے باوجود ایک اعلیٰ کلاس کے لوگ تھے۔ کتابچہ شائع ہونے کے چند روز

بعد ابن انشا گھبرایا گھبرایا میرے دفتر آیا اور فوراً مجھے مولوی صاحب کے پاس لے گیا۔ مولوی صاحب اپنے دفتر میں نہیں، اوپر، چوتھی منزل پر، اپنے رہائشی کمرے میں بیٹھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت سخت گرمی تھی۔ ان کے کمرے میں جو چھت تھی اس کا پنکھا بند تھا۔ انھوں نے بتایا کہ پوری انجمن کی بجلی کٹی ہوئی ہے۔ سرکاری طور پر نہیں۔ کسی عدم ادائیگی کی بنا پر بھی نہیں۔ بس، کسی نے خاموشی سے میٹر توڑ دیا اور تار کاٹ دیا۔ انھوں نے بتایا اور اس مرتبہ میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے جب کہ ہم سب ہمیشہ سے انھیں ایک فولادی مجاہد جانتے تھے، کہ ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے اور اس سے گرمی نا قابل برداشت ہو جانے کی زحمت تو ہے ہی پانی اوپر لگی ہوئی ٹنکی میں نہیں بھرا جا سکتا۔ اس کا مطلب ہے پوری عمارت پانی کے بغیر رہے۔ یعنی انجمن کے ملازمین اور ان کے بچے بھی اسی زحمت کا شکار ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اب ایک ہی ہفتے میں ایسا تیسری بار ہوا ہے۔ ''آپ نے کسی سرکاری ادارے کو خبر کی...؟'' ''وزارت تعلیم کو، کمشنر کراچی کو، ایک دو مرتبہ ایک افسر نما شخص آ کر چکر بھی لگا گیا۔ تار اور میٹر میں نے اپنے خرچ سے دوبارہ لگوایا۔ بجلی والوں کو زیادہ رقم دے کر میٹر کا حفاظتی بکس خاص الخاص لکڑی اور لوہے کا بنوا کر نصب کرایا مگر اس کے گرد چوبیس گھنٹے تو محافظ متعین نہیں رہ سکتا۔ اب اگر تم لوگ کسی مرض کی دوا ہو تو بسم اللہ۔ بہر حال اب میں یہیں رہنا چاہتا ہوں خواہ کسی عالم میں رہوں اور مروں۔ نہیں اب میں ہندوستان نہیں جا سکتا''۔ کچھ یوں گفتگو کی۔ پھر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جب، دوپہر کو حسب معمول چوتھی منزل پر نجی کمرے میں آرام کرنے آ جاتے ہیں تو تین ساڑھے تین بجے (دوسری منزل) دفتر میں فون آتا ہے۔ (اس وقت فون ان کے نجی کمرے میں نہیں تھا اور عمارت میں نیچے سے اوپر تار نصب اب بھی نہیں ہے) نیچے سے ملازم بھاگا بھاگا آتا ہے۔ ''جلدی چلیے۔ وزیر تعلیم فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ گرانٹ کا مسئلہ ہے۔'' یہ دوڑ کر اترتے ہیں۔ فون اٹھاتے ہیں۔ کوئی تحقیق کرتا ہے کہ واقعی مولوی صاحب ہی بول رہے ہیں۔ پھر ایک موٹی سی گالی دے کر بند کر دیتا ہے۔ ''چوں کہ گرانٹ کا معاملہ مسلسل زیر غور رہتا ہے میں اضافہ طلب کرتا رہتا ہوں۔ اس لیے میں ڈرتا

ہوں کہیں کسی مرتبہ نیچے اترنے سے انکار کیا اور کال نچی ہوئی تو کوئی افسر یا وزیر اسی کا بہانہ بنا کر معاملے کو ٹال نہ دے۔'' انھوں نے کچھ یوں بیان کیا۔ ''میں اور ابن انشا مبہوت۔ پھر ہم دونوں رونے لگے۔ پھر اسی طرح کی کئی اور باتیں سنیں بابائے اردو مولوی عبدالحق سے اردو کے مجاہد سے جس نے تحریک پاکستان کی صف اوّل میں بھی کام کیا تھا...

یقیناً وہ زمانہ عمومی طور پر آج سے بہت بہتر تھا۔ حکومتی ادارے اور افراد مشاہیر کی توقیر آج کی نسبت زیادہ کرتے تھے۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ خود بھی سیکڑوں ہزاروں مشکلات و مراحل سے گزر کر آئے تھے اور ذاتی طور پر یا ان کے ناموں سے جانتے تھے لیکن ان کے اختیارات اور اثرات ایسے نہ تھے کہ ان کا ''ایک اشارہ'' حاصل بھی کر لیا جائے تو وہ کوئی معقول کام دکھائے۔ دوم، ہر بات میں قاعدہ قانون بہت چلتا تھا۔ جواب دہی بروقت ہوتی تھی۔ کوئی کسی کی حفاظت کرنے کے لیے محض زبانی شکایت پر چوبیس گھنٹے سرکاری پہرہ نہیں لگوا سکتا تھا اور ابھی مولوی صاحب اس حد تک نہیں جانا چاہتے تھے کہ جن پر انھیں شبہہ تھا ان کے خلاف ان کا نام لے کر کسی سخت کارروائی کے لیے درخواست دیں۔ حکومت بھی کئی برس سے ایک اندرونی خلفشار میں مبتلا تھی۔ روز وزیر تبدیل ہوتے تھے۔ وہ اردو کے معاملے میں اپنے مطالبات پر زور بھی دیئے جاتے تھے۔ وزارت تعلیم حساس اور شاکی رہتی تھی۔ انھیں یقین نہیں تھا کہ کوئی وزیر تعلیم ایک سابق وزیر تعلیم جناب فضل الرحمٰن (مشرقی پاکستان) کی طرح انجمن کی، ان کی، سنے گا اور ان کی مدد پر آئے گا۔ بڑے بددل تھے۔ کالج کے بعض جوشیلے طلبا نے انھیں اپنی خدمات ضرور پیش کی تھیں مگر ایسے روز کے مصائب میں ان سے کیا مدد لی جاتی۔ انھیں بار بار کیسے تلاش کرایا جاتا۔ اور وہ کرتے بھی تو، بالآخر، کیا کر لیتے۔

یہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق تھے جن کی خدمات اردو بلکہ تحریک پاکستان میں بھی نہایت کھلی، عملی اور جاں کاہ خدمات اس وقت تک بھی سیکڑوں مقالوں میں قلم بند ہو چکی تھیں۔ اب پچاسیوں کتابوں میں آ چکی ہیں۔ صرف انجمن ہی سے شائع شدہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب

''قومی یک جہتی میں اردو کا حصہ'' ان کی قربانیوں، استقامت اور جدوجہد سے دستاویزی حیثیت کے ساتھ بھری ہوئی ہے۔ میں کیا پڑی کیا پڑی کا شور با... مگر دو چھوٹے چھوٹے کام تو فوراً ہی کر سکا۔ اپنے تجربہ کار انسپکٹر محمد دین منشی (اللہ اسے بخشے) سے رجوع کیا۔ وہ ایک پرانا، جہاں دیدہ انسپکٹر تھا۔ مجھے ستاتا بھی بہت تھا مگر اس کے تعلقات پولیس اور محکمہ برقیات سے اچھے خاصے تھے۔ اس نے اسی رات تک ایک نیا میٹر کسی بہت محفوظ جگہ، شاید خاص ان کے بیڈ روم میں لگوا دیا اور صرف ذاتی تعلقات کی بنا پر، نہ کہ سرکاری طور سے، دو پولیس والے انجمن کے دفتر میں چوبیس گھنٹے کے لیے تعینات کرا دیے اس طرح کہ انجمن کے عملے کے علاوہ سامنے کالج کا عملہ اور طلبا و اساتذہ بھی انھیں دیکھتے رہیں (شاید یہ ایک غیر ضروری مظاہرہ تھا مگر منشی نے ہم سے اپنے حساب سے کام کرنے کی اجازت لے لی تھی)۔ ساتھ ہی اس نے ایک باقاعدہ ایف۔ آئی۔ آر، دو پولیس والوں سے لکھوا کر تھانے میں درج کرائی اور تھانہ دار سے تفتیش کے احکام اے۔ ایس۔ آئی کو دلوائے جو دوسری صبح ہی کالج کمپاؤنڈ (انجمن کمپاؤنڈ اور کالج کمپاؤنڈ مشترک تھے) میں غیر ضروری طور سے مگر کھلے عام کرسی بچھا کر تحقیق و تفتیش میں لگ گیا۔ نتیجہ کیا نکلنا تھا لیکن قیاس ہے کہ متعلقہ عناصر محتاط ہو گئے۔ اس مہینے صرف دو تین مرتبہ اور فون پر گالیاں دی گئیں۔ پھر فون کے لیے مولوی صاحب کو ایک خفیہ نمبر دے دیا گیا کہ ضروری سمجھیں اس کو گھما دیں۔ فون منقطع ہو جائے گا گو محکمہ اپنے ضوابط کی رو سے انھیں یہ نہیں بتائے گا کہ وہ کس کا فون ہے۔ خود ہی تادیبی کارروائی بھی کرے گا۔ آخری بار ایسا ہوا بھی۔ پھر کوئی کال ایسی نہیں آئی۔ یہ معمولی کارروائی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس سے پہلے کی نہیں گئی تھی۔

مولوی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ انجمن کی دیوار پر اور سول ہسپتال کی دیواروں پر بھی دو علاحدہ علاحدہ پوسٹر ان کے خلاف لگے تھے جن میں ان پر فحش الفاظ میں الزام تراشی تھی۔ ایک اتروانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ہمیں دکھایا۔ دوسرے کا مضمون بتا دیا۔ وہ کسی بڑے پیمانے پر یعنی شہر بھر میں نہیں لگائے گئے تھے۔ بس آس پاس سول ہسپتال تک، ابن انشا نے فوراً انھی کی

رہنمائی میں ایک جوابی پوسٹر لکھا۔منشی نے دوسری صبح تک دوسو کا بیان چھپوا کر مقامی دوکان داروں کو دیں جو انھوں نے اپنی اور آس پاس کی دیواروں پر چسپاں کر دیں۔اس میں تمام الزامات کی تردید کے ساتھ الزام لگانے والوں کے خلاف کچھ قانونی دھمکیاں بھی درج تھیں۔

اس وقت میرے پاس اپنی موٹر نہیں تھی مگر انسپکٹر منشی نے میرے لیے ایک خاصی لمبی موٹر کا انتظام کیا اور مجھے دو تین ہفتے تک ہر دوسرے دن دوپہر کو ٹفن کیریئر دے کر مولوی صاحب کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا جب کہ اکثر و بیشتر ابن انشا اور اردو کالج کے ایک استاد، علی گڑھ کے فارغ التحصیل پروفیسر شجاع احمد زیبا مرحوم بھی آ جاتے تھے۔دکھاوے کے لیے بھی سہی، ہم کھانا مولوی صاحب کے ساتھ کھاتے۔چند بار برادرم مشفق خواجہ نے بھی شرکت کی۔وہ اس وقت ایک بالکل نوعمر ملازم انجمن تھے۔مولوی صاحب کھاتے تو خود کم ہمارے لیے اچھا پکواتے اور شوق سے کھلاتے۔ساتھ ہی میں نے دفاتر اخبارات کے چکر لگائے۔یاد پڑتا ہے کہ ''جنگ'' اور ''انجام'' نے مولوی صاحب کی تحریری شکایت کے بغیر کسی قضیے میں یک طرفہ دلچسپی لینے سے ہی گریز کیا اور مولوی صاحب ان مظالم کی رام کہانی لکھ کر دینے پر تیار نہ ہوئے۔کبھی انھوں نے کچھ کیا ہو تو مجھے یاد نہیں۔میں کوئی محقق ہوں بھی نہیں۔یہ سلسلہ زیادہ نہ چلا مگر مولوی صاحب کو جو صدمہ پہنچنا تھا وہ پہنچ گیا۔وہ فرماتے تھے بھائی سنہ انیس سو بارہ سے جو میں اس کام میں لگا ہوا ہوں اور جن خطرات سے جس طرح گزرا ہوں اُس سب کا یہ انعام وہ بھی اپنے پاکستان میں۔یہ انعام اپنے پاکستان میں...

راقم الحروف اس ذہنی عذاب کی کوئی تصویر کشی نہیں کر سکتا جس سے مولوی صاحب گزرے۔ بس اس کتاب کے متن کے علاوہ وہ عناصر درج فہرست ہیں جن سے کوئی اچھا ادیب ایک نقشہ بنا سکتا ہے ان عذابوں کا جو مولوی صاحب نے ''اپنوں'' ہی کے ہاتھوں اٹھائے۔کون ''اپنے''، جیسا کہ ابتداً عرض کیا، میں نام نہیں لے سکتا۔ان کے بارے میں کسی حد تک علم تو ہے حق الیقین نہیں۔نام لینے کا فائدہ بھی نہیں۔شاید سب ہی مر بھی چکے ہیں۔جواب دینے کی حیثیت میں

نہیں۔ ہاں ان کی قبیل کے بہت سے لوگ اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ اللہ انھی کو توفیق دے کہ رضا کاروں کو آزار نہ دیا کریں، آمین۔

تشکیل نو

اتفاق کہ اسی سال (١٩٥٨ء) سات اکتوبر کو پاکستان کا پہلا مارشل لا آ گیا اور ستائیس کو جنزل ایوب خاں صدر پاکستان بن گئے۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے کوئی تیس اصلاحی کمیشن قائم کیے۔ بعض سخت انتظامی اقدامات بھی کیے۔ اس وقت بہت سے سیاستدانوں بشمول محترمہ فاطمہ جناح نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ اصولاً دستور کو توڑنا ایک نہایت غلط اقدام تھا۔ اس بدعت کا بانی قرار دے کر اس باب میں آج تک ان کی مذمت کی جاتی ہے، بہر حال ان کی حکومت کے تین دور ہیں۔ پہلا ٢٧ اکتوبر ١٩٥٨ء سے جون ١٩٦٢ء تک (دستور دراصل صدر اسکندر مرزا نے توڑا تھا۔ ٧ اکتوبر، پھر ان کے استعفے کے بعد، ٢٧ اکتوبر کو نئے وزیر اعظم جنزل ایوب خاں نے مسند صدارت سنبھال لی تھی اور ٨ جون ١٩٦٢ء کو ایک نیا دستور نافذ کرتے ہوئے، نان پارٹی بنیادوں پر انتخابات کرا کے نئی قانون ساز اسمبلی منتخب کرادی تھی۔ یہ پہلا دور ہے اسی میں انھوں نے تیس سے زیادہ اصلاحی کمیشن بنائے۔ دوسرا دور اس وقت سے جنوری ١٩٦٥ء تک جاتا ہے جب انھوں نے دوسری مرتبہ انتخابات کرائے۔ تیسرا دور جنوری ١٩٦٥ء سے چوبیس مارچ انیس سو انہتر ١٩٦٩ء تک جاتا ہے جب انھوں نے کامیاب احتجاجی تحریکوں کے نتیجے میں اور عارضہ قلب میں مبتلا ہو کر صدارت سے استعفیٰ دیا اور اپنا ہی بنایا ہوا دستور توڑ کر حکومت کمانڈر ان چیف جنزل یحییٰ خاں کے سپرد کردی جنھوں نے اسی وقت دوسرا مارشل لا لگا دیا۔ اپنے دستور کے مطابق انھیں استعفیٰ کی صورت میں صدارت قومی اسمبلی کے اسپیکر کو دینی تھی مگر روایت ہے کہ ایسا یحییٰ خاں نے نہ ہونے دیا۔

بالآخر صدر ایوب سیاسی طور پر ایک سخت متنازعہ فیہ شخصیت کے طور پر اُبھرے ہیں۔ وہ پہلے

دور میں کسی قدر مقبول بھی رہے اور کامیاب بھی۔ پھر نامقبول ہوتے گئے۔ اس تحریر میں نہ مجھے ان کی مدافعت کرنی ہے نہ مذمت نہ کوئی دوسرا تفصیلی تبصرہ، اتنا بتانا نفس مضمون سے ضرور مربوط ہے کہ (دوراول میں) انھوں نے، مولوی صاحب سے نہایت محبتانہ اور مودبانہ سلوک کیا۔ مولوی صاحب نے پاکستان رائٹرز کنونشن (۱۹۵۹ء) کے آخری اجلاس کی صدارت کی (۳۱ جنوری) صدر ایوب خاں آئے میں اسٹیج سکریٹری تھا۔ تمام اخبارات بتاریخ یکم فروری ۱۹۵۹ء گواہ ہیں کہ مولوی صاحب اسٹیج پر اور وہ نیچے صف اول میں بیٹھے ہیں (میں نے انھیں اوپر چڑھنے سے روک کر عرض کیا تھا کہ ہم تو آپ کو سن ہی رہے ہیں آج آپ ہماری سنیں۔ یہ واقعہ اللہ بخشے جناب قدرت اللہ شہاب اور محترمہ قرۃ العین حیدر علاحدہ علاحدہ لکھ چکے ہیں اور اس کے پچاسیوں گواہ آج بھی زندہ ہیں۔ ماہنامہ ''ہم قلم'' کراچی، اگست ۱۹۶۱ء بہت سے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ اس میں یہ تصویر بھی چھپی ہوئی ہے وہ گلڈ کا سالگرہ نمبر ہے) ''ہم قلم'' اگست ۱۹۶۱ء کا یہ پورا باب ماہنامہ ''دنیائے ادب'' کراچی کے خاص نمبر ۲۰۰۲ء میں بھی بجنسہ اسی کتابت اور تصاویر کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ اس میں صدر ایوب کی یہ تصویر بھی شامل ہے... مولوی صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں (جو اِن نمبروں میں بھی موجود ہے) پاکستان میں نفاذ اردو کے سلسلے میں اپنا موقف نہایت واشگاف الفاظ میں بلکہ کسی قدر سختی سے دہرایا تھا (وہ خطبہ بھی اسی نمبر میں موجود ہے)... اس کنونیشن کے بعد جب گلڈ بنا میں گلڈ کی تشکیل میں شدید طور پر مصروف ہو گیا۔ مولوی صاحب ابن انشا کے ذریعے شہاب صاحب سے ملے (وہ اس وقت ایوان صدر میں صدر ایوب کے سکریٹری تھے... دراصل وہ کئی برس سے ایوان صدر میں اسی عہدے پر فائز چلے آتے تھے)... شہاب صاحب نے ان کی شکایات صدر صاحب تک پہنچائیں۔ صدر صاحب نے وزارت تعلیم کو ضروری تفتیش کا حکم دیا۔ وزارت نے بہ سربراہی معتمد تعلیم ڈاکٹر شریف پوری انکوائری کر کے سفارش کی کہ انجمن اور کالجوں کو ایک مارشل لا ضابطے کے ذریعے خصوصی سرکاری تحویل میں دے دیا جائے اس طرح کہ نئی منتظمہ کے صدر مولوی صاحب ہوں... اور رکن رکین مقامی مارشل ایڈمنسٹریٹر اور کمشنر کراچی... منتظمہ بورڈ کے سکریٹری باعتبار عہدہ کمشنر کراچی کے سکریٹری ہوں (وہ

ایک صاحب ، جناب صوفی ہوئے) دو سویلین اراکین مولوی صاحب کے نامزد کردہ۔ ڈاکٹر ریاض الحسن مرحوم اور راقم الحروف... روزمرہ انتظام کے ساتھ اس منتظمہ کو مولوی صاحب کی صدارت اور رہنمائی میں انجمن کے لیے ایک نئے دستور لکھنے کا فرض بھی سونپا گیا جسے صدر پاکستان کے سامنے منظوری کے لیے پیش ہونا تھا...

مولوی صاحب میں، یہ مارشل لا ضابطہ نافذ ہوتے ہی جان آ گئی۔ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو انجمن کے دفتر بلالیا۔ کالج کے پرنسپل معطل (اور پھر غبن سمیت کئی الزامات میں تفتیش کے بعد برطرف)۔ انجمن کا کتب خانہ خاص بند کردیا گیا۔ (تنقیح اور نئی فہرست سازی)۔ کئی اصلاحات۔ کئی چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں۔ دستور کے لیے مسودہ سازی۔ یہ سب اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شروع ہوا۔ پھر مولوی صاحب نے طویل بیماری کے بعد سولہ اگست ۱۹۶۱ء کو انتقال کیا۔ کمشنر کراچی دوسرے آ گئے۔ دستور ۱۹۶۲ء میں منظور ہوکر نافذ ہوا۔ یہ سب ایک علاحدہ اور پوری کہانی ہے۔

اب مجھے انجمن کا معتمد اعزازی ہوئے چالیس برس ہوگئے ہیں۔ بارہ برس اردو کالجوں کا بھی معتمد اعزازی رہا (اس دوران میں نئے پرنسپل کے چلے جانے کی وجہ سے) تین برس منتظم (ایڈمنسٹریٹر) بھی رہا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ میں ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۰ء تک مختلف اعزازی حیثیتوں میں کام کیا۔ اچھا بُرا یہ دوسرے جانیں نوکر پیشہ تو کوئی اکتالیس برس رہا۔ اب عمر کے چھہتر برس پورے کر چکا ہوں۔ آج تک کوئی ایک تجزیہ اس بات کا نہیں کر سکا کہ بہ ظاہر پڑھے لکھے لوگ، خاصے سینئر لوگ بھی، ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہیں جو مولوی صاحب کے ساتھ روا رکھی جاتی تھیں اور خواہ معتوب مولوی صاحب کی حیثیت کا نہ ہو مگر آج بھی بہ اعلان کی جاتی ہیں۔ کیا یہ انسانی شیطنت کے مختلف روپ ہیں؟ جی نہیں مانتا کہ یہ کسی احساس کمتری کے پہلو ہیں؟ احساس کمتری کو تو ایک تقابلی کیفیت کی پیداوار ہونا چاہیے۔ جب تقابل ہی نہ ہو تو احساس کمتری کیوں پیدا ہو۔ یا محض حسد؟ محض حسد کیا چیز ہے... کیا یہ المیہ ہم تیسری دنیا کے معاشروں سے مخصوص ہے؟ اس باب میں میرا مطالعہ کافی نہیں۔ بہر حال ایسا ہمارے معاشرے میں نہیں ہونا چاہیے تھا، نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ، افسوس یہ ہوئے جاتا ہے۔ اس صورت حال کے کئی بُرے نتائج نکل رہے

ہیں ۔ بے غرض ادارے نہیں بن پاتے ۔ بے غرض رضا کاروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے ۔ صاحب اہلیت ، صاحب دل لوگ ۔ داد کے محتاج نہیں مگر سب کے سب اتنے بڑے انسان نہیں ہوتے کہ شرمناک حد تک ہونے والی مخالفتوں ، افواہوں ، تحریروں کو برداشت کیے جائیں ۔ بہت سے بے غرض ، مخلص ، رضا کار ایک منزل پر میدان سے بھاگ جانے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ جب کہ مخالفین کو سوائے کسی شیطانی خوشی کے اور کچھ نہیں ملتا ہوگا ۔ ذرا مولوی صاحب کے حوالے سے ہی ان کے اختلافی مسائل دیکھ لیجیے ۔ ایک آدھ نائب قاصد کی بھرتی اور تعیناتی ۔ کچھ بہت معمولی سے اخراجات اور یہ سب کہاں ۔ خود انھی کے بنائے ہوئے اداروں ، انجمن اور کالجوں میں اور مخالف کون ؟ ان سے بہت جونیئر محترمین جن میں سے بعض تو اساتذہ کے مناصب پر فائز تھے ۔ ہاں غبن وغیرہ کے معاملات دوسری نوعیت کے ہوتے ہیں ۔

اے کمال افسوس ہے

تجھ پر

کمال افسوس ہے

یہ المیہ نہایت شرمندگی کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جارہا ہے ۔ اس لیے کہ ریکارڈ پر تازہ رہے اور اس لیے بھی کہ ، شاید آئندہ لوگ اپنی محترم ، کارکن ، شخصیات کے ساتھ ایسی بدسلوکی کا مظاہرہ بند ... یا کم ... کردیں ۔ بے شک آج مولوی عبدالحق جیسی دوسری شخصیت ہم میں موجود نہیں مگر بعض ان اداروں میں اب بھی رضا کار کام کررہے ہیں جہاں بڑے بڑے تنخواہ دار بھی اس خلوص ، جذبے اور لگن کے ساتھ کام نہیں کرسکتے جو وہ ادارے اور ان کے مقاصد طلب کرتے ہیں ۔

مولوی صاحب نے ایک اور کتابچہ "اردو کا المیہ" بھی شائع کیا تھا ۔ اس کی اشاعت ثانی بھی زیر غور ہے ۔

عرضِ حال

پاکستان کے قیام کو ابھی کچھ اوپر تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ اس کے باہمت وزیر تعلیم مسٹر فضل الرحمٰن نے ایک کل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا ڈول ڈالا۔ اس کے اجلاس ۲۷/نومبر ۱۹۴۷ء کو شروع ہوئے اور پہلی دسمبر ۴۷ء تک رہے۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کے وزراء نظما اور ماہرانِ تعلیم کو مدعو کیا گیا۔ میں اس زمانے میں حیدر آباد دکن چلا گیا تھا۔ اس کانفرنس کا دعوت نامہ مجھے وہیں ملا اور میں ۲۲/نومبر کو کراچی پہنچ گیا اور کانفرنس کے جلسوں میں شریک رہا۔ جب کانفرنس سے فراغت ہوئی تو یہاں کے بعض عہدہ داروں اور معززین سے ملاقات کی۔ غلام محمد صاحب مرحوم وزیر فنانس نے یہ مشورہ دیا کہ ہندوستان میں بھی کام جاری رہے اور پاکستان میں کراچی صدر مقام بنایا جائے۔ مرکزی حکومت ضرور مدد دے گی اور صوبائی حکومت بھی۔ بعض دیگر احباب نے بھی اس رائے کو پسند کیا۔ اس خیال کے آتے ہی یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ انجمن کے قیام کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے قاضی فضل اللہ صاحب وزیر اعلیٰ صوبہ سندھ نے اپنی عنایت سے اس امر پر گفتگو کرنے کے لیے مجھے اور چند اور اصحاب کو چائے پر مدعو کیا۔ جناب قاضی صاحب نے یہ تجویز کی کہ ملیر یا یونی ورسٹی کے رقبے میں انجمن کی عمارت کے لیے

زمین حاصل کی جائے اور خود ملیر میں دس ایکڑ زمین دینے کا وعدہ فرمایا۔

عمارت کے لیے کافی روپیہ جمع کرنا اور زمین حاصل کر کے تعمیر کا آغاز کرنا دور کی بات تھی۔ فی الحال ہمیں قدم جمانے اور کام شروع کرنے کے لیے ایک مناسب مکان کی ضرورت تھی۔ اس غرض کے لیے ہم سید ہاشم رضا صاحب کلکٹر سے ملے، جو زمین ہم نے انتخاب کی تھی اس کی نشان دہی کی۔ انھوں نے فرمایا کہ گجراتی اسکولوں کی عمارتوں میں فی الحال مہاجرین مقیم ہیں، خالی ہونے پر ان میں سے کوئی ایک عمارت انجمن کو دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہم نے گجراتی اسکولوں کی عمارتوں کو جا کر دیکھا۔ بڑی اچھی اور شان دار عمارتیں ہیں۔ ان میں سے گجراتی ایجوکیشن سوسائٹی کی سہ منزلہ عمارت کا انتخاب کیا گیا (یہ وہی عمارت ہے جس میں اب کراچی یونی ورسٹی ہے) پیر الٰہی بخش کی سفارش اور سید ہاشم رضا صاحب ایڈمنسٹریٹر کی عنایت سے یہ عمارت انجمن کے لیے نامزد کر دی گئی۔ لیکن اس میں مہاجرین فروکش تھے، ان سے عمارت کا خالی کرانا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ خود حکومت بھی اس معاملے میں بے بس تھی۔ اس کے چند روز کے بعد ایک دوسرے گجراتی تعلیمی ادارے کی نشان دہی کی گئی۔ اسے جا کر دیکھا تو وہ درحقیقت پہلی عمارت سے کہیں بہتر اور شان دار تھی اور خاص کر ہمارے اغراض و مقاصد کے لیے نہایت موزوں۔ چنانچہ ایڈمنسٹریٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر پہلی عمارت کی بجائے شاردا مندر کی عمارت کے حصول کی درخواست کی۔ ایڈمنسٹریٹر صاحب نے منظوری لکھ دی اور پرچہ نامزدگی دے دیا۔ مگر یہ بھی مہاجرین کے قبضے میں تھی۔ ان سے خالی کون کرائے۔ ایسی حالت میں کام کا آغاز ممکن نہ تھا لہٰذا میں ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء کو دلی واپس چلا گیا۔ وہاں بعض معاملات ایسے تھے جن کا طے کرنا نہایت ضروری تھا۔ وہاں میں ۴ر مارچ ۴۸ء تک رہا، ۱۰ر مارچ کو کراچی پہنچا۔

سید علی شبر حاتمی صاحب کی مستعدی اور مصلحت شناسی کی بدولت شار دا مندر اب خالی ہو گیا تھا، میں نے اللہ کا نام لے کر کل پاکستان انجمن ترقی اردو قائم کر دی ایک مجلس نظما بنائی جس کے لیے میں نے چند اصحاب کو نامزد کیا، اس کے بعد قائد اعظم علیہ الرحمہ کو لکھا کہ میں اب یہاں آ گیا ہوں اور انجمن قائم کر دی ہے، انجمن کے لیے مناسب مکان بھی مل گیا ہے، میری خواہش ہے کہ اس کا افتتاح آپ اپنے دست مبارک سے فرمائیں۔ قائد اعظم نے ۱۷ر مارچ کو میرے خط کے جواب میں لکھا کہ مجھے بہت خوشی ہوئی آپ یہاں آ گئے اور انجمن قائم کر دی۔ اس وقت بہت مصروف ہوں، سرحد کے دورے سے واپسی پر وسط اپریل کے بعد کسی تاریخ کو انجمن ترقی اردو پاکستان کا بڑی خوشی سے افتتاح کروں گا۔ ۲۶ر مارچ پنجاب یونی ورسٹی اردو کانفرنس کی صدارت کے لیے لاہور گیا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ پہلی اردو کانفرنس تھی۔ افتتاح سر شیخ عبدالقادر نے کیا اور پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر نے تعارفی تقریر کی اور ڈاکٹر عمر حیات ملک نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ یہ بڑی اہم اور باوقار کانفرنس تھی۔

احمد آباد گجرات کا سب سے بڑا مرکز ہے وہاں کے مسلمانوں کی زبان اردو ہے اور اردو کی حمایت میں وہ کسی سے کم نہیں۔ انھوں نے اردو کانفرنس کرنے کا انتظام کیا۔ ان کی تمنا تھی کہ میں اس کانفرنس کی صدارت کروں۔ چنانچہ میں مع مولوی سید ہاشمی اور کیفی صاحب یکم راپریل کو احمد آباد پہنچ گیا۔ کانفرنس کا اجلاس ۳ر اپریل کی شب کو ہوا۔ دوسرے روز ضروری قرار دادیں پیش ہوئیں اور شب کو مشاعرہ ہوا۔

کراچی میں کچھ دن قیام رہا۔ اب میں پھر دلّی جانا چاہتا تھا کہ وہاں ابھی بعض معاملات معرض بحث میں تھے۔ روانگی کا سب انتظام کر لیا تھا لیکن چوں کہ بھارت اور حیدر آباد کے تعلقات نازک صورت اختیار کر گئے تھے اور ان لوگوں پر خاص نگرانی رکھی جاتی

اور سختی کی جاتی تھی جن کا تعلق ریاست حیدرآباد سے تھا۔ اس لیے شعیب قریشی صاحب اور دیگر احباب نے میرا دلّی جانا خلاف مصلحت سمجھا اور جانے سے روکا۔ کیفی صاحب کے بھی خط آئے کہ ابھی وہیں ٹھیرے رہو، ادھر کا ہرگز قصد نہ کرنا۔ جب حیدرآباد پر بھارت نے قبضہ کر لیا تو میں ۲/اکتوبر کو دلّی روانہ ہو گیا۔ سب معاملات کا تصفیہ کرنے کے بعد ۶/جنوری ۱۹۴۹ء کو دہلی سے رخصت ہوا۔ بھوپال اور بمبئی میں کچھ دن قیام کر کے ۲۸/جنوری ۴۹ء کو کراچی پہنچا۔ میں اپنے ساتھ اپنا کتب خانہ بھی لیتا آیا جو نادر و نایاب مخطوطات اور مطبوعات پر مشتمل ہے۔ اس کے دوسرے سال میرے عزیز دوست مولوی محمد عمر یافعی صاحب حیدرآبادی اور سید علی شبر حاتمی صاحب نے اپنے اپنے بیش قیمت کتب خانے بڑے خلوص اور محبت سے میری نذر کر دیے۔ ان میں سے ایک کو میں نے کتب خانۂ عام اور دوسرے کو کتب خانۂ خاص کے نام سے موسوم کیا۔ کتب خانہ خاص علمی و ادبی تحقیق کے لیے مخصوص ہے۔ جس سے روزانہ علم وادب کے شائقین مستفید ہوتے ہیں۔

مجلس نظماء کا پہلا جلسہ ۱۳/فروری ۴۹ء کو جناب غلام محمد مرحوم کی صدارت میں ہوا۔ اس میں شعیب قریشی صاحب، چودھری خلیق الزماں صاحب، پیر الٰہی بخش صاحب، صدیق علی خان صاحب مولوی سید ہاشمی صاحب شریک تھے۔

دلّی میں انجمن نے ایک اردو کالج قائم کیا تھا۔ اس میں صرف اردو زبان وادب کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اس میں ابتدائی، اوسط اور اعلیٰ مدارج رکھے گئے تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ایسا کالج بنائیں جس میں تمام علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ دی جائے۔ اس کے مدنظر میں ایک وفد لے کر سر مارس گوایر وائس چانسلر دہلی یونی ورسٹی و چیف جسٹس آف انڈیا کی خدمت میں گیا۔ اس میں نواب صدر یار جنگ (مولوی حبیب الرحمٰن خان شروانی) سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مرزا سعید احمد ڈاکٹر ذاکر حسین، کیفی صاحب اور

مولوی سید ہاشمی صاحب شریک تھے۔ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ اردو کو یونی ورسٹی میں وہی درجہ دیا جائے جو انگریزی زبان عربی اور سنسکرت کو حاصل ہے اور اس کی ایک پروفیسری قائم کی جائے، اور آگے چل کر اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ یہ قدم دلّی یونی ورسٹی ہی اٹھا سکتی ہے نہ صرف اس لیے کہ دلّی کی زبان اردو ہے بلکہ یہ اردو کا جنم بھوم ہے۔ ہم نے یہ مطالبات بطور پیش بندی اس لیے پیش کیے تھے کہ جب ہم اپنے کالج کو اس قابل بنا دیں کہ اس میں تمام مضامین کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ ہونے لگے تو ہمیں یونی ورسٹی سے اس کالج کے الحاق میں مدد ملے۔

اب میں نے یہاں آ کر اس خیال کو پھر تازہ کیا، اور ایک ایسے کالج کے نصاب، معلّمین، مصارف اور عمارت وغیرہ کی ایک اسکیم تیار کی۔ اس میں مجھے ڈاکٹر ہاشمی صاحب پروفیسر سندھ مسلم کالج (سابق ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول) نے بہت مدد دی۔ اس بارے میں پروفیسر حلیم وائس چانسلر سندھ یونی ورسٹی سے بھی گفتگو کی۔ اس گفتگو میں ڈاکٹر ہاشمی بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے تھی کہ انجمن کا اردو کالج، سوسائٹی کالج کے اصول پر بنایا جائے ورنہ گورنمنٹ سے امداد لینے اور مراسلت کرنے میں بہت وقت لگے گا اور وقت پر کام شروع نہ ہوا تو ایک سال ضائع ہو جائے گا۔ (۲۱/مارچ) غلام محمد صاحب مرحوم سے بھی اردو کالج ری سرچ انسٹی ٹیوٹ وغیرہ کے متعلق مشورہ کیا۔ (۲۹/مارچ) وہ سب اصحاب جمع ہوئے، جو ہمارے مجوزہ کالج میں رضا کارانہ، بطور ایثار، کے کام کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ ڈاکٹر ہاشمی نے نصاب، تعلیم، اور درخواست کا مسودہ پڑھ کر سنایا اور ایک آدھ مناسب ترمیم بھی کی گئی۔ (۲/مئی) پروفیسر حلیم وائس چانسلر سے مجوزہ کالج کے متعلق مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا الحاق کے فارم اور درخواست میں اردو ذریعہ تعلیم کا خاص طور پر ذکر کیا جائے۔ (۹/جون) اردو اخبارات کے اڈیٹروں کو مدعو کیا، اور ان سے

درخواست کی کہ انجمن کے مجوزہ کالج کے متعلق اپنے اخباروں میں مضامین لکھ کر ہماری مدد کریں۔ کالج کا آغاز کر دیا گیا۔

۲۰ رجون کو الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل سے ملاقات کی اور کالج کے افتتاح کی درخواست کی، اور کالج کے متعلق تمام حالات بیان کیے۔ انھوں نے عذر کیا کہ ان کے افتتاح کرنے سے ان پر ایک قسم کی پابندی عائد ہو جائے گی۔ اس کے بعد دین محمد صاحب گورنر صاحب صوبہ سندھ سے ملا۔ اس بارے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چوں کہ وہ یونی ورسٹی کے چانسلر ہیں اور کالج کے الحاق کا مسئلہ غور طلب ہے اس لیے ان کا افتتاح کرنا ایسی حالت میں مناسب نہ ہوگا کچھ اور انتظام کیا جائے، اور جلدی نہ کی جائے، اگر کالج نہ چلا تو بدنامی ہوگی اور لوگ کہیں گے کہ عبدالحق کا کالج بند ہو گیا۔ آپ اس پر خوب غور کر لیجیے۔

اس سے قبل میں نے کالج کی ایک مجلس انتظامی بنائی تھی جس کی رکنیت کے لیے چند اصحاب نامزد کیے تھے۔ اس کا ایک اجلاس ۲۳ رجون کو ہوا۔ شعیب قریشی صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب، عبدالواحد صاحب ناظم جنگلات، سید تقی الدین، سید محی الدین، قاضی اختر میاں صاحب، سیٹھ عبداللطیف، ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب، حاتم علوی صاحب، ڈاکٹر محمود حسین صاحب وغیرہ شریک تھے۔ کالج کی مکمل اسکیم، بجٹ اساتذہ کے نام پیش کیے گئے۔ کچھ دیر تک تعلیم وانتظام کے متعلق گفتگو رہی، مولانا عثمانی صاحب نے اس خیال کو بے حد پسند کیا۔

جب گورنر جنرل اور گورنر سندھ نے اپنی معذوری ظاہر کی تو میں نے ۲۵ رجون کو ۱۰ بجے خود کالج کا افتتاح کیا اور اساتذہ اور طلبا کے مجمع میں اردو زبان اور اس کالج کی اہمیت پر تقریر کی۔

۱۱؍جولائی کو سنڈ یکیٹ کا جلسہ تھا۔ پہلے سے ہم نے اور پیر علی محمد راشدی صاحب نے ممبران سنڈ یکیٹ سے مل کر تائید کا وعدہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن باوجود تائید کے وعدے کے پیرزادہ عبدالستار نے بہت مخالفت کی۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ، مسٹر گزدر، قاضی فضل اللہ، حسن علی صاحب وغیرہ جنھوں نے تائید کا حتمی وعدہ کیا تھا، چُپ بیٹھے سُنا کیے اور منھ سے کچھ نہ پھوٹے اور پیرزادہ صاحب کا ساتھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ الحاق نامنظور کر دیا گیا۔ سنڈ یکیٹ کے اس فیصلے سے ایک نئی صورت پیدا ہوگئی۔ ۱۹؍جولائی کو یہ معاملہ کالج کی مجلس انتظامی میں پیش ہوا اور یہ طے پایا کہ ایک یادداشت وزیرِ تعلیم پاکستان کی خدمت میں پیش کی جائے اور اس کے بعد انجمن کا ایک وفد ان سے ملاقات کرے۔

۲۲؍جولائی کو میں وزیراعظم لیاقت علی خان سے ملا۔ کالج کی ساری سرگزشت سنائی۔ فرمایا آپ نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اب بعد میں کہتے ہیں۔ فیڈرل یونی ورسٹی کے بل میں تائید کا وعدہ کیا، اور کہا کہ کالج جاری رکھیے۔ سندھ یونی ورسٹی نے اگر انکار کر دیا تو پنجاب سے الحاق کیوں نہیں کر لیتے، ۸؍نومبر کو وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن صاحب سے ملاقات کی انھوں نے اطمینان دلایا کہ آپ کا کالج ٹوٹنے نہیں پائے گا۔ فیڈرل یونی ورسٹی کا بل کان سٹی ٹیوئنٹ اسمبلی میں پیش ہونے والا ہے، ہم آپ کے کالج کو تسلیم کریں گے اور امداد بھی دیں گے۔ ۲۶؍مارچ کی شام کو ان سے پھر ملا تو کہا کہ میں سندھ یونی ورسٹی کے ارکان سے مل کر گفتگو کروں گا اور انھیں الحاق کے لیے آمادہ کروں گا۔ اگر رضامند نہ ہوئے تو کیبنٹ میں پیش کر کے حکم نکلواؤں گا۔

الحاق کے لیے لڑتے ہوئے مجھے ایک سال سے زیادہ ہوگیا تھا ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی اس لیے کالج کے طلبا بہت مضطرب اور پریشان تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اتنے دنوں سے کالج میں تعلیم پا رہے ہیں اگر الحاق منظور نہ ہوا تو ہماری ساری محنت

رائگاں جائے گی، میں ان کی دل دہی کرتا اور اطمینان دلاتا رہتا تھا۔ آخر میں، مَیں نے کہا کہ میں نے بہت سے معرکے سر کیے ہیں اور کبھی شکست نہیں کھائی۔ ان شاء اللہ اسے بھی سر کر کے رہوں گا۔ الحاق ہو کے رہے گا۔ تم اطمینان سے کام کیے جاؤ۔ آخر سنڈیکیٹ سندھ یونی ورسٹی نے انجمن ترقی اردو کالج کے معائنہ اور تنقیح کے لیے ایک اسپیشل کمیٹی مقرر کی، جس کے ارکان غلام محمد صاحب وزیر فنانس، پیرزادہ عبدالستار، اور پرنسپل شیخ تھے۔ یہ اصحاب ۲۶ر جون ۱۹۵۰ء کو پانچ بجے تشریف لائے اور جماعتوں کی تعلیمی حالت، رجسٹروں کے اندراجات، کالج کے فنڈ اور کتب خانہ وغیرہ کا معائنہ کیا اور ضروری حالات دریافت کیے۔ کسی قسم کا کوئی نقص نہ پایا۔ الحاق کی سفارش کی۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

ایسے کالج کا قائم ہو جانا جس میں یونی ورسٹی کے تمام مضامین کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے ہو انجمن کا بڑا کارنامہ ہے۔ براعظم پاک و بھارت میں اس نوعیت کا صرف ایک یہی کالج ہے۔ لیکن اس عرصے میں ہم علمی و ادبی کام سے بھی غافل نہیں رہے۔ اس کا آغاز بھی ۴۹ء سے ہوا اور ۴۹ء سے ۱۹۵۶ء تک ساٹھ کتابیں شائع ہوئیں جن کی مضمون وار تفصیل یہ ہے:

قدیم اردو

۱۔ قطب مشتری	ملّا وجہی ۱۰۱۸ھ
۲۔ سب رس	ملّا وجہی ۱۰۴۵ھ
۳۔ من لگن	
۴۔ رانی کیتکی	انشاء اللہ خان انشا
۵۔ پھول بن	

لغات وقواعد

۱۔ اسٹوڈنٹس اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

۲۔ پاپولرڈکشنری (انگلش اردو)

۳۔ نوادرالالفاظ

۴۔ قواعد اردو

۵۔ کیفیہ

اصطلاحات

۱۔ فرہنگ اصطلاحات کیمیا

۲۔ فرہنگ اصطلاحات جغرافیہ

۳۔ فرہنگ اصطلاحات فلکیات

۴۔ فرہنگ اصطلاحات بنکاری

۵۔ وضع اصطلاحات

سائنس

۱۔ اضافیت

۲۔ سیر افلاک

۳۔ داستان طبیعیات

۴۔ جراثیمیات

تاریخ و جغرافیہ

۱۔ چین و عرب کے تعلقات

۲۔ تاریخ مسلمانان ہند و پاکستان حصہ اول

۳۔ تاریخ مسلمانان ہند و پاکستان حصہ دوم

۴۔ تاریخ ملتِ عربی

۵۔ تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو

۶۔ تذکرہ اہلِ دہلی

۷۔ تاریخ تمدّن

۸۔ مشاہدات کابل و یاقستان

۹۔ جغرافیہ قرآن

۱۰۔ جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے

تحقیق و تنقید

۱۔ اردو تنقید کا ارتقا

۲۔ روایت کی اہمیت

۳۔ اردو کی نثری داستانیں

۴۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام

۵۔ دلّی کا دبستان شاعری

۶۔ غزل و مطالعہ غزل

۷۔ نیا ادب

ادب

۱۔ مثنوی خواب وخیال

۲۔ انتخاب جدید

۳۔ دیوانِ فغاں

۴۔ خطبات عبدالحق

۵۔ چند ہم عصر

۶۔ نصاب اردو حصہ نثر

۷۔ نصاب اردو حصہ نظم

۸۔ انتخاب کلام میر

۹۔ تلخیص الاردو

۱۰۔ کلیات ولی

۱۱۔ مقالات حالی

۱۲۔ مضامین محفوظ علی

۱۳۔ جلال لکھنوی

۱۴۔ سعادت یار خان رنگین

متفرق

۱۔ تقویم ہجری وعیسوی

۲۔ اردو ذریعہ تعلیم سائنس (اردو)

۳۔ اردو ذریعہ تعلیم سائنس (انگریزی)

۴۔ اردو کی فضیلت اکابر بنگال کی نظر میں (اردو)

۵۔ اردو کی فضیلت اکابر بنگال کی نظر میں (انگریزی)

۶۔ اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ

۷۔ اردو زبان میں علمی اصطلاحات کی تاریخ

۸۔ پاکستان میں اردو کا المیہ

۹۔ اردو کا قاعدہ

۱۰۔ فلسفہ نفس

اس کارگزاری سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ باوجود یہ کہ بعض دوسرے علمی اداروں کے مقابلے میں انجمن کو بہت کم سرکاری امداد ملتی ہے تو بھی اس نے جو قابل قدر کام کیا ہے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے یہ صرف آٹھ سال کا کام ہے۔ آخری دو سالوں .... میں علمی وادبی کام معطل ہے۔ یہ دو سال وہ ہیں جن میں نئے انتظامات اور نئے عہدہ داروں کا عمل دخل رہا۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی۔

کالج کے حسابات کی حالت سید تقی الدین صاحب کے زمانے سے نا قابل اطمینان چلی آ رہی تھی۔ لیکن ۱۹۵۵ء میں جو اطلاعات مجھے ملیں اور ان کے متعلق میں نے اپنے طور پر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حسابات کی حالت ابتر ہے اور بہت سی رقم کا بے جا صرف کیا گیا ہے اور جن کے ہاتھ میں رقوم کا لین دین ہے ان کی دیانت بہت مشتبہ ہے۔ اس بنا پر میں نے کالج کے حالات وحسابات کی تنقیح کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی کی تجویز کی اور اس مضمون کی قرارداد مجلس نظما میں ۴/نومبر ۵۵ء کو عبدالخالق صاحب نے پیش کی اور بالاتفاق منظور ہوئی۔ اس کمیٹی کے تین ارکان تجویز کیے گئے۔ حاتم علوی صاحب داعی (کنوینر) عبدالخالق عبدالرزاق صاحب، پیر حسام الدین راشدی۔ اس کے بعد اسی روز

بجنسہ یہی قرار داد انجمن ترقی اردو کالج کی گورننگ باڈی نے بھی منظور کی۔

اس سے میرا منشا علاوہ دیگر امور کے خاص طور پر حسابات کالج کی اصلاح تھا۔ میری قطعی یہ رائے تھی کہ اگر اس وقت خبر نہ لی گئی تو آئندہ یہ خرابی بڑھتی چلی جائے گی جن کی اصلاح اور بھلائی کے لیے یہ تجویز کی گئی تھی وہی اس کے زبردست مخالف نکلے اور اُس وقت سے آفتاب حسن صاحب پرنسپل اور ان کے رفقاء نے میرے اور انجمن کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔

اس کمیٹی کو تحقیقاتی رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک ماہ کی مہلت دی گئی تھی۔ لیکن اس نے کئی مہینے لگا دیے اور چھ ماہ کے بعد ۲۵ رمئی ۱۹۵۶ء کو کالج کی گورننگ باڈی کے ایجنڈے میں اس کا پیش ہونا درج تھا۔ ایجنڈے کی پہلی مد یہ تھی کہ حاتم علوی صاحب تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ پیش کریں گے۔ چوں کہ وہ اس وقت تک نہیں آئے تھے لہٰذا ان کے آنے تک دوسرے امور پر بحث شروع کر دی گئی۔ حاتم علوی صاحب جب آخر تک تشریف نہ لائے تو حکیم محمد احسن صاحب نے رپورٹ پڑھنی شروع کی۔ میں نے اس پر اعتراض کیا اور ان کو پڑھنے کی ممانعت کی۔ میرے اعتراضات یہ تھے۔

۱۔ اوّل یہ رپورٹ مجلس نظما میں پیش ہونی چاہیے جس نے تحقیقاتی کمیٹی کی تجویز منظور کی اور کمیٹی کے ارکان کا تقرر کیا۔

۲۔ دوسرے اس کمیٹی کی رپورٹ کی نقل مع اختلافی نوٹ کے فرداً فرداً تمام ارکان مجلس نظما کی خدمت میں بھیجنی چاہیے تاکہ اس پر غور کرنے کے بعد مجلس میں بحث کر سکیں۔

۳۔ مجلس نظمائے انجمن ترقی اردو سے قبل اس کے ماتحت ادارے کی گورننگ باڈی میں اس رپورٹ کا پیش کرنا خلاف قاعدہ ہے۔ نیز اس لیے کہ کالج کی گورننگ باڈی

نے بجنسہ اس قرارداد کو جو مجلس نظما نے منظور کی تھی اپنی کارروائی میں شریک کرلیا تھا۔

۴۔علوی صاحب کو اگر جلسے میں آنا منظور نہ تھا تو وہ صدر کو اطلاع کرتے کہ وہ نہیں آسکتے اور رپورٹ پیش کرنے میں معذور ہیں اور رپورٹ کی نقل مجھے بھیجتے۔انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ رپورٹ حکیم صاحب کو بھیجی اور انھوں نے جلسے میں پڑھنی شروع کردی۔

میری ممانعت کے باوجود حکیم صاحب نے پڑھنا بند نہیں کیا اور پڑھتے چلے گئے۔میرے دوبارہ منع کرنے پر ان کے ساتھیوں نے شوروغل مچانا شروع کردیا۔میں جلسہ برخاست کر کے چلا آیا۔مگر حکیم صاحب میجر آفتاب حسن اور ان کے ساتھیوں نے عبدالخالق صاحب کی صدارت میں جلسہ جاری رکھا اور رپورٹ اور اس کا اختلافی نوٹ ہمیشہ کے لیے دفن کردیا گیا۔

میں نے حاتم علوی صاحب کو لکھا کہ براہ کرم تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ اور اختلافی نوٹ کی ایک نقل بھیج دی جائے۔ان کا جواب پڑھ کر مجھے بہت تعجب اور افسوس ہوا وہ لکھتے ہیں کہ ان کے پاس رپورٹ کی کوئی کاپی نہیں،صرف ایک ہی کاپی تھی جو حکیم محمد احسن لے گئے۔چوں کہ ان کے دفتر میں اردو کا کوئی ٹائپ رائٹر نہیں اس لیے نقلیں نہ لے سکے،یہ رپورٹ عبدالخالق صاحب کے ہاں لکھی گئی اور پھر میرے اور ان کے دستخط لیے گئے۔مجھے اختلافی نوٹ کی کوئی اطلاع نہیں۔

یہ اس شخص کا جواب ہے جو تحقیقاتی کمیٹی کا کنویز تھا۔اُن کا یہ عذر کہ ان کے دفتر میں اردو ٹائپ رائٹر نہیں اس لیے نقلیں نہیں لے سکے۔عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔وہ انجمن سے یا انجمن کے کالج سے ٹائپ رائٹر طلب کر کے نقلیں لے سکتے تھے۔کنویز صاحب نے انجمن ترقی اردو اور اس کے کالج سے تحقیقاتی کمیٹی کے مصارف کے لیے پندرہ سو روپے وصول کیے تھے۔وہ اس رقم میں سے چند روپے صرف کر کے رپورٹ اور اختلافی نوٹ کی

نقلیں لے سکتے تھے۔ مگر ارکان کمیٹی نے عمداً ایسا نہیں کیا۔ یہ رقم کمیٹی نے اس لیے لی تھی کہ علاوہ معمولی اخراجات کے ایک مستند آڈیٹر کی خدمات حاصل کی جائیں گی تا کہ وہ حسابات کی باقاعدہ تنقیح کرے۔ لیکن کنوینر صاحب اور دیگر ارکان نے دانستہ اور کسی خاص غرض کے مدنظر اس سے پہلوتہی کی اور ایک ناقص، مہمل اور مضحک رپورٹ پیش کردی۔ جس میں تحقیقات اور دیانت دونوں مشتبہ نظر آتی ہیں۔ البتہ ایک رکن پیر حسام الدین راشدی صاحب نے بخلاف باقی دو حضرات کے اپنی دیانت کو داغدار نہیں ہونے دیا اور اپنے اختلافی نوٹ میں بعض صریح خلاف ورزیوں اور رقمی بدعنوانیوں کا صاف الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ پیر صاحب نے صرف سرسری نظر ڈالنے سے یہ گرفت کی ہے۔ اگر کوئی مستند آڈیٹر حسابات کی باقاعدہ تنقیح کرتا تو ایسے سربستہ راز کھلتے اور ایسی چوریاں پکڑی جاتیں جنھیں دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے۔ باوجود متواتر مطالبہ کے اب تک رپورٹ مجلس نظما میں پیش نہیں کی گئی اور دبالی گئی ہے۔

کراچی کے ایک رسالہ ''نیا راہی'' نے پیر صاحب کا وہ اختلافی نوٹ اپنے نمبر بابت ماہ جولائی ۱۹۵۸ء میں پورے کا پورا شائع کردیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اختلافی نوٹ از پیر حسّام الدین صاحب راشدی: ۔

انجمن ترقی اردو کی مجلس نظما اور اردو کالج کی گورننگ باڈی نے اپنی ایک قرارداد کے ماتحت جو معلوماتی کمیٹی مقرر کی تھی اس کے دو ارکان جناب سیٹھ حاتم علوی صاحب اور جناب عبدالخالق عبدالرزاق صاحب کی پیش کردہ رپورٹ کے ساتھ میں متفق ہوں۔ سوائے ان چند باتوں کے جن کے متعلق تھوڑا سا اختلاف رائے رکھتے ہوئے میں اپنے تاثرات ذیل میں درج کررہا ہوں۔

(۱) محمد موسیٰ کے متعلق جناب صدر صاحب نے یہ شکایت کی تھی کہ وہ تنخواہ کالج سے پاتا ہے لیکن کام پرنسپل صاحب کے یہاں بحیثیت موٹر ڈرائیور کے کرتا ہے۔ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی۔ معلوماتی کمیٹی کے دو ارکان اس چیز کو قابل اعتراض نہیں سمجھتے، لیکن میری رائے میں پرنسپل صاحب کا یہ فعل مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر مستحسن نہیں ہے:

(الف) جہاں تک میرا علم ہے کسی اور کالج میں یہ دستور نہیں کہ کوئی پرنسپل اپنے ادارے میں تنخواہ پانے والے ملازم سے موٹر ڈرائیوری کا کام لیتا ہو۔

(ب) انجمن ترقی اردو کالج ایک خالص قومی ادارہ ہے اور ایک خاص مقصد اور جذبے کے ماتحت اسے چلایا جا رہا ہے، جب کہ دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری کالجوں میں پرنسپل صاحبان کو یہ مراعات حاصل نہیں، تو اس قومی کالج کے پرنسپل صاحب کو جو کہ کافی تنخواہ پا رہے ہیں، اس قسم کی چیزوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ خاص طور پر جو کالج مشنری اسپرٹ سے کام کر رہا ہو اس کے پرنسپل کو قطعی تزکیہ نفس سے کام لینا چاہیے۔

اس لیے میری رائے ہے کہ آئندہ پرنسپل صاحب کو محمد دین موسیٰ سے جو کالج کا اردلی ہے موٹر ڈرائیوری کا کام نہیں لینا چاہیے اور اگر ان کو ایسا کرنا ہی ہے تو گورننگ باڈی سے اس کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔

(۲) جناب صدر صاحب نے اپنے شکایتی مکتوب کے ذریعہ کمیٹی سے یہ شکایت فرمائی تھی کہ کالج کے چپراسی مسمی عبدالرحیم سے پرنسپل صاحب گھر پر خانگی کام لیتے ہیں۔ تحقیقات کی بنا پر پرنسپل صاحب کے بیان سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مذکورہ چپراسی پرنسپل صاحب کے گھر پر کام کرتا ہے اور چوں کہ وہ ضعیف العمر ہے اس لیے اس سے ہلکا کام لیا جاتا ہے۔ ہلکے کام کی پرنسپل صاحب نے کوئی تصریح نہیں فرمائی۔ اس سلسلے میں

میری رائے ہے کہ:

اگر وہ ضعیف العمر ہے تو محض پرورش کی خاطر اسے کالج کی ملازمت میں نہیں رکھنا چاہیے۔ نیز پرنسپل صاحب کو گھر پر کالج کے کسی چپراسی سے ہلکا یا بھاری کام نہیں لینا چاہیے۔

(۳) محمد شریف شان اہلکار کالج کی تنخواہ اسّی روپے ماہوار ہے اور کالج میں ان کی ڈیوٹی شام سے شروع ہو کر رات کے غالباً دس بجے ختم ہوتی ہے۔ شریف شان نے کمیٹی کو یقین دلایا ہے کہ وہ کسی دوسری جگہ دن کے اوقات میں مستقل ملازمت نہیں کرتے۔ البتہ ضرورت کے ماتحت مختلف اداروں میں دن کے اوقات میں وہ غیر مستقل طور پر اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے کام کر لیتے ہیں۔

میں اس معاملے میں کمیٹی کے دو ارکان کی رائے سے متفق ہوں کہ ان کا یہ فعل قابل اعتراض نہیں ہے، اگر چہ کالج کے ساتھ انھوں نے مستقل ملازمت ملنے پر جو معاہدہ کیا ہے اس کی رُو سے یہ چیز قابل اعتراض ضرور ہے۔ اس معاہدے اور کالج کے قوانین کی رُو سے گورننگ باڈی کو دیکھنا اور فیصلہ کرنا چاہیے کہ محمد شریف شان کالج میں کام کرنے کے علاوہ بھی کام کر سکتا ہے یا نہیں۔

(۴) کالج نے جو رقم تعمیرات اور مرمّت کی مَد میں خرچ کی ہے وہ مبلغ ۱۳۴۰۸ روپے پانچ آنے ۹ پیسے ہوتی ہے۔ راقم نے جناب عبدالرزاق صاحب کے ساتھ جو کام مذکورہ رقم میں کیا گیا ہے دیکھا، اس سلسلے میں مجھے دو چیزیں سخت قابل اعتراض نظر آئیں جن کی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر سخت دکھ ہوا۔

(الف) جو تعمیر ہوئی ہے وہ بالکل معمولی اور اتنی رقم کی قطعی طور پر نہیں ہے جو رقم ٹھیکیدار نے وصول کی ہے۔

(ب) شروع سے اب تک کالج کا تعمیری یا مرمتی کام ایک ہی ٹھیکیدار محمد مرتضیٰ سے کرایا گیا ہے۔ حالانکہ دستور کی رُو سے ٹینڈر طلب کرنے کے بعد ہی اس ٹھیکیدار کو کام دینا چاہیے تھا جو مقابلتاً کم نرخ پیش کرے۔ میرے خیال میں جناب پرنسپل صاحب نے ذاتی اعتماد کی بنا پر ٹھیکیدار سے یہ کام لیا ہے اور یقیناً انھوں نے اپنے اعتماد میں دھوکا کھایا ہے۔ ذاتی اعتماد کا لفظ میں نے اس وجہ سے استعمال کیا ہے کہ اگر ذاتی اعتماد درمیان میں نہ ہوتا تو کیا وجوہ تھیں کہ ایک ہی ٹھیکیدار سے دستور کے خلاف شروع سے آخر تک کام لیا جاتا۔

(۵) جناب صدر نے یہ بھی شکایت کی تھی کہ کالج کے احاطہ میں پڑی ہوئی ایک پرانی موٹر پرنسپل صاحب نے وہاں سے منتقل کر کے اپنے دولت خانے میں رکھوالی ہے اور اس سے مرغی خانے کا کام لیا جا رہا ہے۔ جناب ممدوح کے بیان سے صدر صاحب کا یہ الزام ثابت ہوا۔

اس کو مرغی خانے کے طور پر استعمال کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ موٹر بے کار تھی لیکن اس کے باوجود پرنسپل صاحب کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ چیز جو اویکیو پراپرٹی کے ماتحت آئی ہو اور حکومت نے بطور امانت انجمن ترقی اردو کے سپرد کی ہو اس کو اٹھا کر اپنے گھر لے جائیں۔ اس قسم کا ڈھانچہ جو کوڑا کرکٹ میں شمار کیے جانے کے قابل ہو اس کو گھر لے جا کر رکھنے میں، میں معلوم نہ کر سکا کہ پرنسپل صاحب کے ذوق کی اس سے کیا تسکین ہوتی ہوگی اور کون سی ایسی روحانی طمانیت ان کو پہنچتی ہوگی۔

اس سلسلے میں مجھے ایک اور چیز بھی کہنی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب شاردا مندر کی عمارت انجمن کے سپرد کی گئی تھی اس وقت عمارت کے ساتھ ساتھ بہت سا سامان از قسم فرنیچر واسباب باغبانی انجمن کے سپرد کیا گیا تھا اور راقم چارج لینے کے وقت موجود تھا۔ جو سامان

اس وقت دیکھا گیا تھا، بظاہر آج اس سے بہت ہی کم سامان پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ اُس وقت کوئی فہرست بنائی گئی تھی یا نہیں۔ اگر کوئی ایسی فہرست موجود ہو تو انجمن کے ارکان کو فوراً جائزہ لینا چاہیے۔ کیوں کہ انجمن کی عمارت اور اس میں پڑا ہوا تمام متروکہ سامان اویکیو پراپرٹی ہے اور جب تک کہ حکومت کے ساتھ کوئی فیصلہ نہ ہو ہم اس مالیت کے امانت دار ہیں لہٰذا ہمیں معاملے کی نوعیت اور اہمیت کو قطعی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

(۶) ہم اپنی مصروفیات کی وجہ سے بعض امور کی تحقیق نہ کر سکے، مثلاً:

(اول) لیبارٹری کے سامان اور آلات کے حسابات کا جائزہ نہیں لیا جا سکا۔

(دوم) گملے اور کھاد کی گاڑیاں جو بقول صدر صاحب، پرنسپل اور منتظم صاحب کے گھروں پر ناجائز طور پر جا چکی ہیں، ان کی تحقیقات بھی نہیں کر سکے ہیں۔

(سوم) صدر صاحب کی شکایت تھی کہ پرنسپل صاحب ان لڑکوں پر سختی کرتے ہیں جو جناب صدر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں یا ملتے ہیں۔ اس امر کی تحقیق بھی ہم نہ کر سکے۔

(چہارم) کالج میں مختلف پارٹیاں قائم کر کے پھوٹ ڈالی جاتی ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں بھی ہم کوئی تحقیق نہ کر سکے۔

(پنجم) صدر صاحب نے ۲ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو اپنے خط کے ساتھ ہمیں تین تحریریں بھیجی تھیں جن میں سے ایک اردو کالج کے طالب علموں کی طرف سے تھی دوسری تحریر بھی ایک طالب علم کی تھی اور تیسری تحریر کالج کے پروفیسر صاحبان کی بھیجی ہوئی تھی۔ ان تحریرات میں جو الزامات لگائے گئے ہیں ان کی تحقیقات بھی نہیں کر سکے۔ یعنی ان تمام امور کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے وقت اور فرصت کی ضرورت ہے جو کہ ذاتی کاروبار میں مصروف رہنے کی وجہ سے ہم اراکین

معلوماتی کمیٹی کو حاصل نہیں ہے، یا کم از کم مجھے اتنی فرصت حاصل نہیں ہوتی کہ میں دوسرے اراکین کے ساتھ رہ کر پورے معاملات کی تحقیق کر سکوں۔

میری رائے ہے کہ جناب صدر صاحب کو آیندہ ہر ماہ چیکوں پر دستخط کرنے سے پیشتر تمام اندراجات اور حسابات کا خود ذاتی طور پر جائزہ لینا چاہیے تا کہ بعد میں شکوک وشبہات پیدا ہونے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ صدر صاحب کو کالج کے دفتری اور حسابی کاروبار بھی وقتاً فوقتاً ملاحظہ فرمانا چاہییں۔

دوسری ضروری چیز جس پر مجلس نظما انجمن ترقی اردو اور گورننگ باڈی اردو کالج کے ارکان کو فوری توجہ دینی چاہیے۔ یہ ہے کہ پچھلے آٹھ دس ماہ سے انجمن اور کالج کے اراکین میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے انتہائی شرمناک ہیں اور دونوں اداروں کی عزت و ناموس کو ناقابل تلافی حد تک نقصان پہنچ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دونوں اداروں کے اراکین انتظامی نے اگر یہ حرکات بند نہ کیں تو یہ ادارے تباہ ہو جائیں گے۔ اس لیے دونوں مجالس کی خدمت میں میری مخلصانہ گزارش ہے کہ وہ اس طرف فوری توجہ دیں اور کوئی ایسی صورت نکالیں جس سے پیدا شدہ اختلافات ختم ہو جائیں اور جو دماغ اس وقت منصوبے بازی اور سازشی کارروائیوں میں مصروف ہیں وہ آیندہ اداروں کی فلاح و ترقی میں مصروف ہو جائیں۔ نیز اگر یہ معلوم ہو کہ بعض افراد کے وجود سے یہ اختلافات پیدا ہوئے ہیں تو ان افراد کو اداروں کے فلاح و بہبود کے پیش نظر فوراً علاحدہ کر کے اس عفونت آمیز فضا اور مکدر شدہ ماحول کو صحیح اور صحت مند بنایا جائے۔

حسام الدین راشدی

میجر آفتاب حسن صاحب پرنسپل انجمن ترقی اردو کالج نے ان الزامات کی کوئی تردید نہیں کی۔ اگر ان کو اپنی دیانت پر اعتماد ہے اور ان کا دامن پاک ہے تو انھیں رپورٹ

اور اختلافی نوٹ پیش کرنے میں کیوں تامّل ہے ان کی خاموشی اور صفائی پیش نہ کرنے سے بدگمانی کو اور تقویت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ کالج بھی بدنام ہو گیا۔ ڈسپلن تو پہلے ہی ناقص تھی، تعلیمی حالت بھی خراب ہو گئی۔ امتحانات کے نتائج بھی اچھے نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سال طالب علم بہت کم داخل ہوئے ہیں۔ اب یہ تعلیمی ادارہ نہیں رہا بلکہ سازشوں اور فسادات کا گھر ہو گیا ہے۔ بہت سے طالب علموں اور بعض استادوں سے پروپیگنڈے کا کام لیا جاتا ہے۔ تعلیمی مقاصد پس پشت ڈال دیے گئے ہیں۔

اب تک میں صدر، سکریٹری اور خازن، تینوں کے فرائض انجام دے رہا تھا، اس خیال سے کہ ترقی کی رفتار زیادہ تیز ہونی چاہیے، ایک معتمد اور ایک خازن کے انتخاب کی تجویز پیش کی تا کہ مجھے روزمرہ کے نظم ونسق کتابوں کے انتخابات اور طباعت اور حسابات کی نگرانی اور روزانہ مراسلت سے نجات مل جائے اور میں اپنا وقت خالص علمی وادبی کام میں صَرف کر سکوں اور لغات و اصطلاحات کے بعض کام جو تکمیل طلب ہیں، ان کی تکمیل کر سکوں اور معتمد صاحب اور خازن صاحب انجمن کے نظم ونسق، پریس، حسابات اور فراہمی سرمایہ کا کام انجام دیں جواب تک معتمد انجام دیتا رہا، چنانچہ انجمن کی مجلس نظما کے جلسہ منعقدہ ۳/ جولائی ۵۶ء میں میری تجویز کے مطابق ڈاکٹر معین الحق صاحب کا انتخاب معتمدی کے لیے اور شوکت علی خاں صاحب کا خازن کے عہدے کے لیے انتخاب کیا گیا۔ میں خوش تھا کہ اب کام زیادہ تیزی سے، زیادہ مقدار میں اور زیادہ بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر معین الحق صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کم سے کم دو گھنٹے روزانہ انجمن کے دفتر میں کام کیا کریں گے۔ مگر وہ یہ وعدہ پورا نہ کر سکے۔ میرے اصرار پر یہ وعدہ کیا کہ ہفتے میں ایک بار جمعہ کے روز دفتر میں آ کر کام کیا کریں گے لیکن وہ اس وعدہ کو بھی نہ نبھا سکے۔ ان کو فرصت بہت کم تھی۔ وہ آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سکریٹری اور ڈائرکٹر آف ریسرچ تھے۔ اگر وہ پابندی

سے کام نہیں کر سکتے تھے تو اس کے لیے خیر یہ عذر تھا کہ وہ عدیم الفرصت ہیں۔ لیکن ان صاحبوں نے غضب یہ کیا کہ اپنے عہدوں کا چارج لینے کے بعد ہی انجمن کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ انجمن میں لاکھوں کا غبن ہے۔ بعض اصحاب نے یہ شکایت مجھ تک پہنچائی میں نے اس کا یقین نہ کیا، کیوں کہ انجمن کا دفتر اور تمام حسابات اُن کے ہاتھ میں ہیں وہ ہر وقت تنقیح کر کے اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔ وہ انجمن کے باہر اس قسم کا پروپیگنڈا کیوں کرنے لگے۔ میں نے خیال کیا کہ جیسا کہ عام قاعدہ ہے لوگ اس قسم کی شکایتیں پہنچا کر ہمیں آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔ لیکن جب انھوں نے ہسٹاریکل سوسائٹی کے ایک جلسے میں جلسے کے بعض شرکا سے اس الزام کا اعادہ کیا اور جناب فضل احمد کریم فضلی صاحب نائب صدر انجمن ترقی اردو پاکستان اور جناب سید محمد تقی صاحب مدیر روزنامہ ''جنگ'' نے مجھ سے آ کر یہ کہا تو مجھے سخت رنج اور صدمہ ہوا۔ اس کے بعد مجلس نظما کا جو جلسہ ہوا اس میں میں نے خاص طور پر سید محمد تقی صاحب اور فضلی صاحب کو شرکت کی زحمت دی، اور دونوں صاحبوں کی موجودگی میں میں نے ارکان مجلس سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب تک معتمد صاحب اور خازن صاحب نے اپنے طریق عمل سے انجمن کی کارروائیوں میں جو خرابیاں اور رکاوٹیں پیدا کیں اور انجمن کو نقصان پہنچانے کے لیے جو تخریبی کارروائیاں کیں وہ سب میں نے برداشت کیں۔ لیکن انجمن کے معتمد اور خازن ہوتے ہوئے بغیر کسی ثبوت اور تحقیق کے اس قسم کا ذلیل پروپیگنڈا کرنا سراسر غداری ہے۔ میں ایسے صاحبوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ اگر آپ ان کو انجمن میں رکھنا چاہتے ہیں تو آپ صدارت کے لیے کسی دوسرے کا انتخاب کر لیں۔ دونوں صاحب یعنی معتمد صاحب اور خازن صاحب چپ بیٹھے میری تقریر سنتے رہے اور ایک لفظ بھی اپنے حق میں زبان سے نہ نکال سکے۔ اگر ان میں ذرہ برابر بھی غیرت ہوتی تو اسی وقت اُٹھ کر چلے جاتے اور کبھی انجمن میں اپنا منھ نہ دکھاتے۔ لیکن بعض

صاحبوں نے جو ان کے حامی تھے اور ایک دو ایسے صاحبوں نے جن کا اصول ہے ''میرے دونوں میٹھے'' بیچ میں پڑ کر اس معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی اور میں چپ ہو رہا اور اب ایک اور پارٹی میری اور انجمن کی مخالفت میں تیار ہو گئی۔

باوجودیکہ ہمارے حسابات آڈٹ ہو چکے تھے اور وزارت تعلیم کو بھیج دیے گئے تھے تاہم میں نے جناب فضلی صاحب کی تحریک پر جو دونوں جانب رسوخ رکھتے ہیں اور اکثر غلط پروپیگنڈے سے نادانستہ طور پر متاثر ہو جاتے ہیں اس بات کی اجازت دی کہ یہ حضرات اپنی پسند کا آڈیٹر مقرر کر کے حسابات کی تنقیح کرا لیں اور اپنا اطمینان کر لیں۔ چنانچہ ایک آڈیٹر سلیم قادری اس کام پر متعین کیے گئے۔ لاکھوں کا غبن اب گھٹتے گھٹتے ہزاروں پر آ گیا اور اب صرف چند ہزار تک رہ گیا ہے۔ آڈیٹر کی رپورٹ مجلس نظما (منعقدہ ۱۰؍ مارچ ۵۷ء) میں پیش ہوئی اور ارکان مجلس نے انجمن پریس کے منیجر کو معطل کرنے کی قرارداد پیش کی۔ میں نے کہا کہ پہلے منیجر کا جواب لیا جائے اگر ان کا جواب ناکافی ہو تو پھر مناسب کارروائی کی جائے۔ میری اس تجویز کو نہ مانا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پریس منیجر نے غلط الزامات کی بنا پر ازالہ حیثیت عرفی کی نالش کر دی۔ ارکان مجلس نظما نے آڈیٹر کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ کمیٹی نے یہ رائے دی کہ اس معاملہ کی تحقیقات سی آئی ڈی کے سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ یہ معاملہ تخمیناً ایک سال سے زیادہ تک سی آئی ڈی کے زیر تحقیقات رہا اور اب چوں کہ عدالت میں پیش ہے اس لیے اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا عدالت جو فیصلہ کرے گی ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔

ڈاکٹر معین الحق صاحب سکریٹری اور شوکت علی صاحب خازن کے وقت کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ میں نے جو اردو خواتین کالج قائم کیا تھا اسے ان صاحبوں نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ اگر چند روز اور مدد دی جاتی تو سرکاری گرانٹ منظور ہو جاتی اور یہ کالج چل

نکلتا۔ میں چاہتا تھا کہ انجمن کے کالج کے اصول پر خواتین کا کالج بھی ہو جس میں تمام علوم وفنون کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے ہو۔ مگر افسوس کہ یہ حضرات اس کی اہمیت کو مطلق نہیں سمجھے۔ یہ عذر کوئی عذر نہیں کہ انجمن کے پاس اس کی مدد کے لیے کافی فنڈ نہیں۔ اگر نہیں ہے تو فراہم کرنا چاہیے۔ سرمایہ کا فراہم کرنا معتمد اور خازن کا فرض ہے۔ کسی کام کے بنانے میں بڑی محنت، دماغ سوزی اور سرگردانی کرنی پڑتی ہے۔ بگاڑنے میں کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ یہ حضرات انجمن کو بدنام کرنے کے لیے تعمیر کی بجائے تخریب کی طرف مائل تھے۔

اس سے قبل کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ مجلس نظما کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۳۱رجولائی ۱۹۵۶ء میں سالانہ رپورٹ اور میزانیہ پیش ہوا۔ آفتاب حسن صاحب نے یہ اعتراض کیا کہ میزانیہ میں بیلنس شیٹ نہیں۔ اس پر فضل الرحمٰن صاحب نے یہ تجویز کی کہ عبدالخالق صاحب، شوکت علی خاں صاحب اور ڈاکٹر معین الحق صاحب بیلنس شیٹ تیار کریں۔ یہ ایک معمولی کام تھا لیکن آفتاب حسن صاحب اور ان کے رفقا کو اس کمیٹی کے پردے میں انجمن کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کمیٹی کے ارکان تخمیناً آٹھ مہینے تک دفتر کی مسلوں اور کاغذات اور حسابات کے رجسٹروں اور پریس کی کارگزاری کے تمام رجسٹروں کا معائنہ کرتے رہے اور بیرونی اشخاص سے بھی مشورے کرتے رہے۔ مگر بیلنس شیٹ نہ پیش کر سکے۔ ان کا مقصد بیلنس شیٹ پیش کرنا نہ تھا بلکہ وہ اس ٹوہ میں سرگرداں تھے کہ کوئی دفتری خامی یا حسابی بے عنوانی ہاتھ لگ جائے تو مجھے اور انجمن کو بدنام اور رسوا کرنے کا موقع ملے۔ جب ایسی کوئی بات نہ ملی تو آخر تک وہ بیلنس شیٹ بھی نہ پیش کر سکے۔ اس سے ان صاحبوں کی ذہنیت، نیت اور فطرت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ اب تیسری پارٹی میرے اور انجمن کے خلاف تیار ہوگئی۔

پہلی پارٹی وہ تھی جو انجمن ترقی اردو کالج کی تحقیقاتی کمیٹی کے قائم ہونے کی وجہ سے مخالف تھی نیز وہ اصحاب جو اس کمیٹی کے ارکان تھے۔

دوسری پارٹی وہ تھی جنھوں نے انجمن کے خلاف بغیر کسی ثبوت اور تحقیق کے لاکھوں کے غبن کا پروپیگنڈا کیا اور باوجود انجمن کے عہدہ دار ہونے کے اپنے ہی ادارے کے خلاف ایسے غلط پروپیگنڈے کے مرتکب ہوئے اور اپنی ہی انجمن سے غداری کی۔ یہ پارٹی جس کے سرکردہ ڈاکٹر معین الحق اور شوکت علی خاں صاحب تھے، آفتاب حسن صاحب کے زبردست پروپیگنڈے سے اس قدر متاثر اور مرعوب ہوئے کہ انھوں نے باہم یہ سمجھوتہ کرلیا کہ کالج پر تم قابض ہو جاؤ انجمن کو ہم سنبھال لیں گے۔ اب دونوں پارٹیوں نے مل کر انجمن کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ تیسری پارٹی میں وہ لوگ ہیں جو بیلنس شیٹ تیار کرنے کے لیے مقرر ہوئے تھے اور جو اس بہانے سے انجمن کے خلاف غبن وغیرہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ کئی مہینے کی کوشش کے بعد بھی اپنے منصوبے میں ناکام رہے۔

چوتھی پارٹی وہ ہے جس نے آڈیٹر سلیم قادری کی رپورٹ کو بغیر کسی تبصرے اور تنقیح کے آسمانی صحیفہ تصور کرلیا اور اس کی نقلیں تک ارکان مجلس کو نہ دیں کہ اس پر غور کرسکیں اور آنکھ بند کر کے اس کی ہر مد اور ہر تنقیح کو تسلیم کرلیا۔

ان پارٹیوں میں اکثر اصحاب مشترک ہیں اور چوں کہ مقصد قریب قریب ایک ہے اس لیے ان سب کا گٹھ جوڑ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ایسے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں جو انجمن کی بدنامی کا موجب ہوئے۔ اس تخریبی گروہ کے سرکردہ میجر آفتاب حسن پرنسپل انجمن ترقی اردو کالج اور حکیم محمد احسن صاحب شریک معتمد انجمن و سکریٹری انجمن کالج ہیں۔ انھوں نے انجمن میں پارٹی بازی کی خطرناک بدعت کا زہر پھیلایا۔ غلط افواہیں پھیلا کر دوسروں کے دلوں میں انجمن کی طرف سے بدگمانی پیدا کی اور

اپنا ہم خیال بنا کر غلط پروپیگنڈے میں شریک کیا اور انجمن میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا کر کے اور غیر ضروری امور کو اہمیت دے کر اور معمولی اور ادنا باتوں کو بے حد پیچیدہ صورت میں پیش کر کے ارکان انجمن کو الجھاؤ میں ڈال دیا ہے۔ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ ارکان انجمن ان جھگڑوں میں پھنسے رہیں اور ان کو اس کا موقع ہی نہ ملے کہ کالج کی تحقیقاتی رپورٹ کی طرف توجہ کر سکیں۔ کیوں کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر یہ رپورٹ منظر عام پر آئی تو صرف وہی گرفت میں نہ آئیں گے جو ان حسابات کے ذمہ دار ہیں بلکہ تحقیقاتی کمیٹی کے ارکان بھی اعانت اور جانب داری کے الزام سے نہ بچیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب نے مل کر انجمن کے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر معین الحق صاحب کے استعفیٰ کے بعد ڈاکٹر محمود حسین خان کا آنا ان کے حق میں ایک غیبی تائید ہوگئی۔ ان کو پہلے سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر محمود حسین کا نام انجمن کی معتمدی کے لیے تجویز کیا گیا ہے اس لیے ان پارٹیوں کے سرگروہوں نے مل کر ایک خاص پلان (منصوبہ) بنایا۔ اس پلان کے مدار حکیم احسن قرار پائے اور ان کو شریک معتمد تجویز کیا گیا۔ جس کوشش میں وہ اب تک ناکام رہے تھے اس کی کامیابی کا غیب سے سامان ہوگیا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی فطرت سے خوب واقف تھے، چنانچہ جب انتخاب سے پہلے مجلس نظما میں ان کا ذکر آیا تو حکیم محمد احسن اور ان کے بعض رفقا نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کمزور شخص ہیں ان سے کام نہیں چلے گا۔ فضلی صاحب نے بھی مجھ سے اس کا ذکر کیا اور انھیں یہ بات کسی قدر ناگوار ہوئی۔ آفتاب حسن صاحب اور حکیم محمد احسن نے ان کی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انجمن، انجمن کے انتظام اس کے کارکنوں اور صدر کے خلاف ان کے کان خوب بھرے اور یہ بات اچھی طرح ان کے ذہن نشین کردی کہ یہ سب چور اور خائن ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب انجمن کے جلسوں میں پورے بھرے ہوئے آتے تھے، سیدھے منھ سے بات

نہیں کرتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بارود بھرا ٹینک کسی غنیم کو بمبارڈ کرنے آیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکیم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو تو الگ بٹھا دیا اور سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ کوئی خلاف ورزی ایسی نہ تھی جو نہ کی ہو۔ کوئی بدعنوانی ایسی نہ تھی جس کا ارتکاب نہ ہوا ہو اور کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو ان سے عمل میں نہ آئی ہو۔ آتے ہی سب سے اوّل یہ کیا کہ پرانے چوکیدار کو جس پر میرا اعتماد تھا ہٹا کر اس کی جگہ ایسے شخص کو لائے جس کا میں نے بداعمالی کی وجہ سے پریس میں تبادلہ کر دیا تھا۔ جب میں نے ڈاکٹر محمود حسین خان سے اس پر احتجاج کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ بھی رہے گا اور وہ بھی رہے گا حالانکہ دو چوکیداروں کی مطلق ضرورت نہ تھی، بلاوجہ انجمن کا روپیہ ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ لیکن حکیم احسن کے حکم کو کیسے ٹال سکتے تھے۔ درحقیقت اس نئے شخص کا تقرر چوکیداری پر نہیں بلکہ جاسوسی کی خدمت پر کیا گیا تھا۔ یہ لوگوں کو میرے پاس آنے سے روکتا ہے اور جو اس کے روکنے کی پروا نہیں کرتے ان کی رپورٹ حکیم صاحب کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ میرے ساتھ کام کرنے والے یا میرے خاص ہمدرد میرے پاس نہیں آنے پاتے، انھیں زدوکوب کرنے کی دھمکی دی جاتی اور وہ ڈر کر انجمن میں قدم نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے ایک شریف آدمی غنڈوں سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انجمن کے کارکنوں کو مجھ سے ملنے کی ممانعت ہے۔ وہ حکیم صاحب کے عتاب سے ڈرتے ہیں۔ چند اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بلا کسی معاوضہ کے از راہ ایثار لڑکیوں کو یونی ورسٹی امتحانات کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ انھیں پڑھانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی تھی، میرے پاس آئیں تو میں نے انھیں نیچے کی گیلری میں پڑھانے کی اجازت دے دی۔ اس کے متعلق حکیم صاحب نے جو شرمناک کارروائی کی اس کی کیفیت آپ آیندہ اوراق میں پڑھیں گے۔ یہ حرکت محض مجھے زک دینے کے لیے کی گئی تھی۔ ملازمین کو ڈرا دھمکا کر میرے خلاف قابل الزام بیانات لکھوائے جاتے ہیں۔ میرا فون ٹیپ کیا جاتا ہے،

میں کہیں جاتا ہوں تو میرے پیچھے جاسوس لگے رہتے ہیں۔ میرے خط سنسر کیے جاتے ہیں میرے کتب خانے پر پانچ چھ حملے کیے گئے تاکہ کچھ کتابیں اڑا لیں اور مجلس نظما میں پیش کریں اور ثابت کریں کہ بازار میں بکتی ہوئی پکڑی گئیں۔ کتب خانے کا انتظام ناقص ہے، حکیم صاحب کے حوالے کر دیا جائے، ان ذلیل حرکات کی تفصیل آپ آیندہ اوراق میں پائیں گے۔ مجھے منصب صدارت سے خارج کر کے سرپرستوں کی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ حکیم صاحب کا یہ ادّعا تھا کہ ہم عبدالحق کو اس قدر اذیتیں پہنچائیں گے کہ وہ چند مہینے میں ختم ہو جائے گا۔ پھر ہم اس کے کتب خانوں اور انجمن پر قبضہ کر لیں گے۔ یہ سب حرکات اس منصوبے کے پورا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ اس شخص کی جسارت یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ اپنے سازشی رفقا کی حمایت اور اکثریت کے بل پر ایسی قراردادیں مغالطہ یا دھوکا دے کر منظور کرا لی جاتی ہیں جو خلاف دستور ہیں اور معتمد ڈاکٹر محمود حسین صاحب چوں تک نہیں کرتے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور یہ بیٹھے دیکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے خلاف دستور انجمن بلاضرورت نئی آسامیاں قائم کر کے اپنے مطلب کے دو شخصوں کو انجمن میں ملازم رکھ لیا ہے۔ ان میں سے ایک صفی الحسن زیدی ہے جس کی تنخواہ پونے تین سو روپے ہے، اور دوسرا عبدالمجید جس کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ہے۔ یہ دونوں حکیم صاحب کے مطب میں کام کرتے ہیں اور تنخواہ انجمن سے پاتے ہیں۔ برائے نام ایک پھیرا انجمن میں بھی لگا جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جھوٹوں بھی کبھی یہ نہ پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں، کیوں رکھے گئے ہیں۔ ان کا کیا کام ہے۔ کس کی منظوری سے ان کا تقرر کیا گیا ہے۔ حکیم صاحب کی دیدہ دلیری دیکھیے کہ وہ مولوی عبدالعلی خان صاحب مددگار معتمد کو حکم دیتے ہیں کہ مولوی صاحب کے تمام خطوط کھول کر پڑھا کرو اور ان میں جو کچھ لکھا ہو وہ ہم سے بیان کیا کرو۔ جب مددگار صاحب نے اس حکم کی تعمیل سے معذوری ظاہر کی تو انھیں معلم اخلاق

جناب میجر آفتاب حسن صاحب ایم ایس سی (علیگ) بی ایس سی (لندن) پرنسپل انجمن ترقی اردو کالج کی خدمت میں بھیجا۔ جناب پرنسپل صاحب نے ہدایت فرمائی کہ حکیم صاحب کے حکم کی تعمیل کرو اور خط کھول کر پڑھا کرو، اس میں کوئی ہرج نہیں۔ مددگار صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے علم میں یہ سب کچھ ہے لیکن انھیں جرات نہیں کہ وہ حکیم صاحب سے اس خلاف اخلاق خلاف قانون مجرمانہ فعل کی نسبت باز پرس کریں۔ ان کے باز پرس نہ کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خود اس میں شریک ہیں اور اعانت جرم کر رہے ہیں۔ کالج کے فاضل پرنسپل، یونی ورسٹی کے نامور پروفیسر اور انجمن ترقی اردو کے معتمد اور سابق میئر کراچی کارپوریشن، حال شریک معتمد انجمن و معتمد انجمن ترقی اردو کالج کے یہ اخلاق ہوں تو اس کالج اُس یونی ورسٹی اور اس انجمن کے حق میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدا ان کے حال پر رحم فرمائے۔

انجمن کا پریس جب سے ان حضرات کے دست اختیار میں آیا ہے، اُس کی حالت بہت ابتر ہو گئی۔(۱) رسالہ اردو کبھی وقت پر شائع نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس کے مضامین دو دو مہینے پہلے دے دیے جاتے ہیں۔ جولائی کا ''اردو'' اب تک نہیں چھپا، صرف چند صفحے چھپے ہیں۔ قاموس کتب اردو کی پہلی جلد کی طباعت ماہ مارچ ۵۸ء میں شروع ہوئی۔ ۱۸۰ ایام میں صرف ۱۸۰ صفحے چھپے ہیں یعنی فی یوم ایک صفحہ۔ طباعت اگر اسی رفتار سے رہی تو پوری کتاب کے طبع ہونے میں دس سال سے زیادہ صرف ہوں گے۔ جب مطبع کی حالت ایسی ابتر ہے تو اس سے یہ کہیں بہتر ہوگا کہ پریس بند کر دیا جائے اور کتابیں دوسرے

---

(۱) یہ دلچسپ بات ہے کہ پریس کا منیجر ایک ایسے شخص کو بنایا گیا ہے جو پریس کے کام سے قطعاً ناواقف ہے اور اس سے قبل انجمن ترقی اردو کالج میں ٹائپسٹ تھا۔ اسسٹنٹ منیجر کا تقرر بھی ذاتی تعلقات کی بنا پر کیا گیا ہے اور اس کو پریس کے کام کا صرف اتنا تجربہ ہے کہ وہ پہلے ایک مقامی پریس میں کمپوزیٹر تھا۔

مطبعوں میں چھپوائی جائیں وہ سستی چھپیں گی اور اچھی چھپیں گی۔ اس ابتر حالت کو دیکھ کر بعض اصحاب نے اپنی کتابیں جو ان کی تصنیف یا ترجمہ تھیں اور انجمن کو دی تھیں وہ واپس لے لیں۔ انجمن کے سالانہ اجلاس میں پریس کی جو رپورٹ پیش کی گئی ہے وہ بہت مضحکہ خیز ہے۔ اس میں بازاری کتابوں کی طباعت پر فخر کیا گیا ہے۔ ایسی طباعت تو ادنیٰ سے ادنیٰ مطبع بھی کرتا ہے۔ انجمن کا پریس اس غرض کے لیے قائم نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے قیام کی غرض یہ تھی کہ انجمن کی علمی و ادبی کتابیں صحیح اور بروقت چھپیں اور چھپائی اچھی ہو۔ مگر ڈیڑھ سال سے علمی کام تقریباً بالکل معطل ہے۔ انجمن میں کسی کو علم اور ادب کا ذوق نہیں۔ انتظام کا شوق ہے اور انتظام میں تعطّل، برطرفی، تبادلہ، روپے کا بے جا صرف اور غیر ضروری تقررات شامل ہیں۔ پچھلے سال یعنی ۵۷ء ۵۸ء کی رپورٹ میں علمی کارگزاری قابل دید ہے۔ لکھا ہے کہ اس سال صرف تین کتابیں شائع ہوئیں۔ (۱) جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے (۲) سعادت یار خاں رنگین (۳) مقالات حالی۔ مقالات حالی پرانی کتاب ہے اور چوتھی بار چھپی ہے۔ اب رہ گئیں دو کتابیں۔ یہ دونوں ۱۹۵۶ء میں زیر طبع تھیں۔ پچھلے سال کی علمی کارگزاری صفر ہے۔ ویسے خود رپورٹ بھی عجیب و غریب ہے بیشتر حصہ اس رپورٹ کا ان پچھلی رپورٹوں کی نقل ہے جو میری لکھی ہوئی ہیں اور جو بے سمجھے نقل کر دیا گیا ہے اور جسے سال گزشتہ کی کارگزاری سے کوئی تعلق نہیں رپورٹ میں یہ بھی نہیں بتایا گیا اس وقت کس قسم کا علمی اور ادبی کام ہو رہا ہے۔ علمی کام کرے کون؟

سب سے عجیب بات یہ ہے کہ معتمد صاحب کو اپنے عہدے کا چارج لیے تخمیناً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اس مدت میں انھوں نے ایک بار بھی انجمن کے دفتر میں قدم رنجہ نہیں فرمایا۔ وائے برحال انجمن، جس کا معتمد اور شریک معتمد ایسے اوصاف سے متصف ہوں۔

اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں انجمن میں نہ تو کوئی نئی علمی یا ادبی کتاب شائع ہوئی اور نہ کسی تحقیقی کام کی کوئی صورت پیدا کی گئی اور نہ آئندہ کے لیے کوئی علمی ادبی پروگرام تجویز کیا گیا۔ معاملات میں پے در پے الجھنیں بڑھتی گئیں۔ اخباروں میں ان حالات پر سخت نکتہ چینی اور اعتراضات کیے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے فرار میں اپنی سلامتی دیکھی اور ۲۸ رجون کو استعفیٰ بھیج دیا اور ۱۱ر جولائی کو اپنے عہدے کا چارج شریک معتمد کو دے دیا۔ یہ استعفیٰ مجلس نظما منعقدہ ۹ر اگست ۵۸ء میں پیش ہوا مجلس نے ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی اور ایک وفد بھی ان کی خدمت میں اسی غرض سے حاضر ہوا۔ اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ انھوں نے استعفیٰ واپس لیا یا نہیں دفتر میں کسی کو معلوم نہیں کہ معتمد کوئی ہے بھی یا نہیں، سارا کام خدا کے بھروسے پر چل رہا ہے۔

یہ حالت بہت نازک اور خطرناک ہے، اسے دیکھ کر مجھے سخت رنج اور صدمہ ہے۔ اس تھوڑے سے عرصے میں انجمن کا انحطاط اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ اگر چندے یہی حالت رہی تو شاید اسے وہ روز بد دیکھنا پڑے جس کا اندیشہ ہے میں نے تقریباً پچاس سال تک اس انجمن کے بنانے، ترقی دینے، انجمن کے مقاصد پورا کرنے اور اردو کے وقار کو بڑھانے کے لیے ہر قسم کی محنت و مشقت اور جدوجہد کی اور اپنا دل و دماغ اور سرمایہ اس کی نذر کر دیا۔ میں اپنی زندگی میں اسے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر میں خاموشی سے ایک تماشائی کی طرح یہ سب کچھ دیکھتا رہا تو مجھ سے زیادہ قابل ملامت کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ اسے ہلاکت سے بچانا دردمندانِ اردو کا فرض ہے، ورنہ میں اس زندگی پر موت کو ترجیح دوں گا۔

معرفت نیست دریں قوم خدایا مددے
کہ برم گوہر خود را بہ خریدار دگر

عبدالحق

ڈاکٹر محمود حسین صاحب کے استعفیٰ کا جواب

ڈاکٹر محمود حسین صاحب کا مراسلہ ۲۸ر جون کا لکھا ہوا مجھے ملا جس میں انھوں نے انجمن کی معتمدی سے اپنا استعفیٰ پیش کیا ہے۔ استعفیٰ تو صرف دو سطروں میں ہے۔ باقی سات صفحوں میں الزامات کا ایک طومار ہے جو انھوں نے مجھ پر عائد کیے ہیں۔ اس نوازش کو انھوں نے صرف پاکستان کی دہ سالہ مدت تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ اس سے پہلے کی زندگی پر بھی نظر کرم ڈالی ہے۔ ان الزامات میں (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا) اکثر بے بنیاد، لغو، فرضی اور مصنوعی ہیں، بعض اصل واقعات سے متعلق ہیں، جن کو مسخ کر کے ایسے پیرائے میں پیش کیا ہے کہ ان کی صورت الزامات کی ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان میں سے کسی کے متعلق ذاتی علم نہیں۔ ان کے شریک معتمد یا ان کے بعض مشیر جو کچھ ان کے کان میں پھونک دیتے ہیں وہی کہنے لگتے ہیں اور اچھا خاصا گراموفون کا کام دیتے ہیں اور جو کچھ یہ حضرات لکھ کر دیتے ہیں اس پر بے سوچے سمجھے اور بعض اوقات بغیر پڑھے دستخط فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ کراچی کے صحافیوں کا معزز وفد جو ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اس کے استفسار پر انھوں نے اس کا اعتراف کیا۔ بعض وقت بڑی ہنسی آتی تھی، جب کہ ان کے

شریک یا مشیر جلسے میں کسی گزشتہ واقعہ کا ذکر کرتے جس کا ڈاکٹر صاحب کو کوئی علم نہ تھا تو بھی یہ ان ہی کی سی کہنے لگتے تھے۔ اس بات کے جتانے پر بھی کہ اس واقعہ کے وقت نہ آپ موجود تھے اور نہ آپ کو اس کی اطلاع تھی وہی کہے جاتے تھے جو ان کے مشیر کی زبان سے نکلا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس کا موقع عنایت فرمایا کہ میں اُن کے فرضی افسانوں اور پڑھائے ہوئے سبق پر تبصرہ کر کے یہ بتاؤں کہ ان کے مشیروں نے ان کو اپنا آلہ کار بنا کر ان سے وہ کام لیا ہے جس کے کرنے کی وہ خود جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ بدنامی ہوگی تو ڈاکٹر صاحب کی ہوگی ان پر کوئی حرف نہ آئے گا۔

یہ مراسلہ کئی اعتبار سے عجیب وغریب ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ان ہی کے دست وقلم کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نادر تحریر ان ہی کے ذریعے سے ہمیں وصول ہوئی ہے۔ اس میں ہجّے اور املا کی غلطیاں، آداب انشا سے ناواقفیت، جملوں کی بے ربطی وغیرہ، دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی اسکول کے نوآموز طالب علم کی خام مشق ہے۔ رہا نفس مضمون اور اس کا اسلوب تحریر تو وہ ایسا عامیانہ اور سوقیانہ ہے کہ اسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یونی ورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر کے قلم سے ایسی سفیہانہ تحریر کیوں کر نکلی۔

ڈاکٹر صاحب نے انجمن کے حالات سے واقفیت کا جو دعوا فرمایا ہے وہ بھی صحیح نہیں وہ سنی سنائی یا اپنے شریک کی پڑھائی ہوئی باتیں اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ان کے سامنے واقع ہوا ہے۔ مثلاً انھوں نے لکھا ہے کہ کالج کے ایک جلسے میں جو رات کے وقت انجمن کے صحن میں ہو رہا تھا انجمن کی عمارت سے گملے پھینکے گئے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ انجمن کی عمارت میں نیچے سے لے کر چوتھی منزل تک سب زینے کھلے ہوئے ہیں کہیں کوئی دروازہ نہیں جو چاہے اوپر تک بے روک ٹوک آ سکتا ہے۔ طالب علموں میں باہم نیز طالب علموں اور پرنسپل صاحب میں کئی سال سے اَن بَن چلی آ رہی ہے بعض

طالب علم جو مخالف تھے پہلی منزل پر چڑھ آئے اور نیچے جلسے کی طرف دو ایک گملے پھینکے۔ اس وقت انجمن میں میرے سوا کوئی دوسرا شخص نہ تھا، اور ظاہر ہے کہ میں گملے کیوں پھینکنے لگا۔ پرنسپل صاحب نے اپنی نا اہلی اور طلبا کی خودسری پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ الزام تراشا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی خوش فہمی سے اسے انجمن کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ یہ کالج کے ڈسپلن کی خوبی کا اظہار تھا۔ جس کے متعلق عام شکایت ہے۔ یہ واقعہ کئی سال پہلے کا ہے۔

ایک قصہ کسی موٹی گالی کا لکھا ہے کہ جس کی اطلاع ڈاکٹر صاحب کو ان کے مخبر نے دی تھی اور اسے انھوں نے بے چوں و چرا تسلیم کر لیا اور یہ بھی نہ پوچھا کہ معاملہ کیا تھا اور گالی کسے دی شاید تاریخ کے پروفیسر کے لیے تحقیق لازم نہیں۔ بلاشبہ اس قصے کے گھڑنے میں بڑی جانفشانی سے کام لیا گیا ہے۔

اسی طرح انھوں نے مولوی تقی الدین، مولوی سید ہاشمی اور قاضی احمد میاں کے متعلق میرے برتاؤ کی شکایت لکھی ہے۔ قاضی احمد میاں جونا گڑھ کے خوش حال جاگیر دار تھے۔ جونا گڑھ پر جب بھارت نے قبضہ کر لیا تو قاضی صاحب ہجرت کر کے گوا چلے گئے اور کچھ عرصے کے بعد کراچی چلے آئے۔ ان ایام میں انھیں بہت تکلیف اور مصیبت اٹھانی پڑی۔ یہاں بے روزگار اور بے کار تھے۔ ان کے وہ احباب جو ان کی قدر دانی کے مدعی ہیں انھوں نے کبھی ان کی کوئی مدد نہ کی البتہ اپنی محفل کی رونق کے لیے ان سے زبانی خوش کرنے کی باتیں کرتے رہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ایک سو روپیہ ماہانہ کی خدمت پیش کی گئی جسے انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے کراچی پہنچ کر انجمن قائم کی اور مجھے ان کی بے کاری اور تکلیف سے آگاہی ہوئی تو بہت افسوس ہوا اگر چہ اس وقت انجمن کی مالی حالت قابل اطمینان نہ تھی تاہم میں نے انھیں انجمن میں چار سو روپے ماہانہ تنخواہ پر لے لیا۔

وہ انجمن میں کئی سال تک بڑے اطمینان اور خوشی سے کام کرتے رہے کچھ عرصہ بعد انھوں نے مجھے لکھا کہ موجودہ تنخواہ میں گزارہ مشکل ہے، تنخواہ پانچ سو روپے کر دی جائے۔ چنانچہ میں نے ان کی حسب منشا تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔ چند ہی روز بعد سندھ یونی ورسٹی میں ایک بیش قرار تنخواہ پر لکچراری پیش کی گئی جو انھوں نے منظور کر لی۔ ایک تو اس کی تنخواہ زیادہ تھی دوسرے آیندہ ترقی کی توقع تھی۔ ان کو مجھ سے کبھی شکایت نہیں ہوئی اور ہمیشہ زبانی نیز تحریر میں مرے برتاؤ کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے اس مضمون کے خطوط میرے پاس اس وقت بھی موجود ہیں البتہ انھوں نے سید تقی الدین کے ناشائستہ برتاؤ کی سخت شکایت کی جس سے وہ بہت رنجیدہ اور ملول ہوئے اور اس بارے میں مجھے ایک دردناک طویل خط لکھا جسے پڑھ کر مجھے بھی بہت افسوس اور رنج ہوا۔ وہ خط بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس قسم کی بدتمیزی سید تقی الدین نے مولوی سید ہاشمی صاحب سے بھی کی اور اسی طرح کی بدتہذیبی اور بدکلامی کا برتاؤ جب طالب علموں سے کیا تو طلبا برگشتہ ہو گئے اور ان کے خلاف بڑا ہنگامہ کیا۔ اس پر ان کی کالج سے علیحدگی عمل میں آئی۔ یہ بہت مستعد اور کام کے آدمی تھے، مگر نہایت بدمزاج اور جذباتی اور روپے پیسے کے معاملے میں بہت مسرف۔ جہاں کہیں رہے ان کا یہی حشر ہوا۔ بہار گورنمنٹ میں یہ معزز خدمتوں پر مامور تھے پہلے ڈپٹی کلکٹر بعد میں انڈر سیکرٹری ہو گئے، وہاں گورنمنٹ کے حکام سے لڑ پڑے اور نہایت بدتہذیبی اور بدتمیزی کے مراسلے لکھے اس پر حکومت نے انھیں برخاست کرنے کی تجویز کی۔ مسٹر عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا کو یہ معلوم ہوا تو انھیں بچا لیا اور آخر حکومت نے ... تنزل کر کے ڈپٹی کلکٹری پر بھیج دیا۔ وہاں بھی نہ نبھ سکے اور الگ ہونا پڑا۔ وہاں سے حیدرآباد آئے یہاں بھی ان سے اسی قسم کی حرکات سرزد ہوئیں اور ایک بار خدمت سے برخاست کر دیے گئے۔ بعد میں بحال ہو گئے اور پولیس ایکشن سے پہلے ہی بعض وجوہ کی بنا پر انھیں حیدرآباد سے ہجرت کرنی

پڑی، پاکستان آ کر جب ان کی مالی حالت بہت سقیم ہوگئی اور ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ رہا تو میں نے شہید ملت لیاقت علی خان سے ان کی سفارش کی اور انھوں نے از راہ عنایت ایک خدمت کے لیے سفارش فرمائی لیکن غلام محمد صاحب نے جو اس وقت وزیر مالیات تھے۔ اس بنا پر اختلاف کیا کہ انھوں نے حیدرآباد کی رقم کے حسابات پیش نہیں کیے۔ غلام محمد صاحب جب گورنر جنرل تھے، تو میں نے پھر سفارش کی مگر انھوں نے توجہ نہ کی۔ مولوی سید ہاشمی صاحب کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ان سے اب بھی برادرانہ اور عزیزانہ تعلقات ہیں اور حال میں جو بعض تحریریں انھوں نے میرے متعلق لکھی ہیں وہ اس کی شاہد ہیں۔ ڈاکٹر معین الحق کے بارے میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کم سے کم دو گھنٹے روزانہ انجمن میں کام کریں گے، لیکن معتمدی کا چارج لینے کے بعد وہ انجمن میں نہیں آئے۔ جب میں نے اصرار کیا تو کہا کہ ہفتہ میں ایک بار جمعہ کے روز آیا کروں گا لیکن اس وعدے کے ایفا کی بھی نوبت نہ آئی اور الٹا انجمن کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کیا جب اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو مجبوراً استعفیٰ دے دیا۔

فضل کریم فضلی صاحب دو سال سے میرے سر تھے کہ ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو انجمن کا معتمد بنایا جائے، میں نے کہا انھیں اتنی فرصت کہاں کہ اس کام کو انجام دیں، مگر وہ برابر مصر رہے، جب میں نے ڈاکٹر معین الحق کا نام تجویز کیا تو اس وقت بھی انھوں نے اصرار کیا، میں نے کہا اب تو میں معین الحق صاحب کا نام تجویز کر چکا ہوں، فی الحال ممکن نہیں۔ جب ڈاکٹر معین الحق مستعفی ہوئے تو فضلی صاحب نے مجھے پھر گھیرا۔ اب وہ مجھے ڈاکٹر محمود حسین صاحب کے ہاں لے گئے۔ پہلے تو انھوں نے کچھ انکسار اور انکار کیا، بعد میں رضامند ہو گئے ان کا یہ بیان تصحیح طلب ہے کہ شریک معتمد کا استعفیٰ اس غرض سے دلوا دیا کہ ان کو شریک معتمد کے انتخاب کا موقع ملے۔ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ جب انھوں نے

رضامندی کا اظہار کیا تو فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ شریک معتمد آپ کو سکھاتے ہیں، میں نے کہا آپ کام لے کر دیکھیے اگر آپ کے منشا کے مطابق کام نہ کریں تو پھر ہم کوشش کریں گے کہ کوئی دوسرا انتظام کر دیا جائے۔ اس پر خاموش ہو رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ سید عین الدین سے بہت خوف زدہ ہیں تو میں نے سید عین الدین صاحب سے یہ سب واقعہ بیان کیا، وہ شریک معتمدی کے عہدے سے الگ ہونے پر رضامند نہ تھے کیوں کہ وہ ان لوگوں کی چالوں سے بہ خوبی واقف تھے لیکن میرے سمجھانے بجھانے پر اور مجبور کرنے سے رضامند ہو گئے فضلی صاحب نے بھی ان سے گفتگو کی اور وعدہ لے لیا، جس کو فضلی صاحب نے اکثر اوقات سراہا بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس عہدے کے لیے حکیم محمد احسن کا نام تجویز کیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی خاطر اور مروت سے سید عین الدین صاحب کو مجبور کر کے استعفیٰ دلوایا تھا، مگر ڈاکٹر صاحب نے اس جگہ کے لیے مجھ سے مشورہ تک نہ کیا اور جب میں نے اُن کا اس قدر خیال کیا تو انھیں بھی اور کچھ نہیں تو کم سے کم کسی ایسے شخص کا نام تجویز کرنا چاہیے تھا جس پر میرا بھی اعتماد ہوتا ہے۔ میں نے فضلی صاحب سے بہت کہا اور بتایا کہ دیکھیے اس شخص کی وجہ سے انجمن اور کالج میں تعلقات بہت کشیدہ اور خراب ہو گئے ہیں، انجمن میں اس کا آنا بہت بُرا ہوگا لیکن فضلی صاحب نے میری بات نہ مانی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ منصوبہ پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا کہ جس طرح انجمن میں جھگڑے پیدا کر کے کالج کو انجمن سے الگ کرنے کی تجویز کی جا رہی ہے اب انجمن پر بھی پورا قبضہ کرنے کا قصد کیا جائے گا۔ مجھے معلوم نہیں فضلی صاحب کو بھی اس مفسدانہ منصوبے کی اطلاع تھی یا نہیں۔ میرا گمان ہے کہ انھیں معلوم ہو گیا تھا، وہ بھی اس سازش کا شکار ہو گئے تھے اس کے بعد انھیں تمام بدعنوانیوں اور خرابیوں کی اطلاع ہوتی رہی اور وہ خاموشی سے دیکھتے رہے اور ان کے رفع کرنے کی کوشش نہ کی۔ ورنہ یہ نوبت ہی نہ آتی۔ بہرحال

جب میں نے یہ رنگ دیکھا تو میں نے یہ عہد کرلیا کہ میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے شریک کار کے کاموں میں کسی قسم کی مداخلت نہ کروں گا اور خاموشی سے اپنا کام کرتا رہوں گا۔ جب حکیم صاحب نے دیکھا کہ میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کرتا تو انھوں نے خواہ مخواہ چھیڑ خوانی شروع کی تا کہ جھگڑا پیدا کر کے اس منصوبے کو پورا کیا جائے جو پہلے سے ان کے پیش نظر تھا۔ سب سے اول انھوں نے انجمن کے چوکیدار کو یہاں سے ہٹانے کا حکم دیا اور اس کی جگہ ایسے شخص کو بھیجنا تجویز کیا جس کا بد اعمالی کی وجہ سے تبادلہ کر دیا گیا تھا میں نے ڈاکٹر محمود حسین صاحب کو لکھا کہ یہ شخص دو ڈھائی سال سے ملازم ہے نہایت معتبر اور کارگزار ہے میں انجمن میں چوبیس گھنٹے اکیلا رہتا ہوں یہاں ایسے ہی چوکیدار کی ضرورت ہے جس پر میرا اعتماد ہو اس پر ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ انجمن میں بہت چوریاں ہوتی ہیں، اس لیے انتظام کیا گیا ہے۔ یہ شخص بھی رہے گا اور اسے انجمن سے تنخواہ دی جائے گی اور دوسرا شخص بھی رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب چوریوں کے معاملے میں بہت روشن ضمیر معلوم ہوتے ہیں کہ ایک ہفتہ کے اندر انھیں یہ معلوم ہو گیا کہ انجمن میں چوریاں ہوتی ہیں۔ اُس وقت چوریاں ہوتی تھیں یا نہیں لیکن اب جو چوریاں ہو رہی ہیں اس کی ڈاکٹر صاحب کو خبر تک نہیں پہلی روشن ضمیری اب تاریک ضمیری میں بدل گئی ہے درحقیقت یہ نیا شخص چوکیدار نہیں ہے جاسوسی کی خدمت پر مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ پہلے چوکیدار عبدالرحمٰن خان کو حسب سابق انجمن سے تنخواہ دی جائے لیکن شریک معتمد صاحب نے جو حقیقی معتمد ہیں چھ ماہ تک تنخواہ نہ دی اور میں... اپنے پاس سے دیتا رہا یہ سب کچھ اس لیے کیا جا رہا تھا کہ مجھے تکلیف دی جائے اور کوئی جھگڑا پیدا کیا جائے۔ میں ان کا منشاء سمجھ گیا اور خاموش رہا۔ چھ مہینے کے بعد جب انھیں انجمن کے ملازمین کی تنخواہ کے لیے چیک پر میرے دستخط کی ضرورت ہوئی تو میں نے کہا کہ جب تک عبدالرحمٰن خان کی تنخواہ کی رقم قبض الوصول

اور چیک میں داخل نہ کی جائے گی میں دستخط نہ کروں گا۔ مجبور ہو کر دوسرا چیک بنایا اور بینک سے رقم وصول کر لی گئی لیکن عبدالرحمٰن کی تنخواہ رقم اپنے پاس رکھ لی اور اسے ادا نہ کی۔ وہ چاہتے تھے میں اس پر کچھ جھگڑا کروں لیکن میں ان کے علی الرغم خاموش رہا اور وہ اپنے شرانگیز ارادے میں پھرنا کام رہے۔ دوسرے مہینے انھیں پھر چیک پر میرے دستخطوں کی ضرورت ہوئی تو میں نے کہا کہ جب تک عبدالرحمٰن خان کو ان کی تنخواہ ادا نہیں کی جائے گی میں دستخط نہیں کروں گا تب مجبور ہو کر بادل نخواستہ ان کی تنخواہ دینی پڑی۔

اس کے کچھ دنوں کے بعد چند اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین میرے پاس آئیں اور یہ درخواست کی کہ ہم اپنی بہنوں کو تعلیم دینا چاہتی ہیں تاکہ وہ کراچی یونی ورسٹی کے امتحانات میں شریک ہو سکیں ہم کوئی معاوضہ لینا نہیں چاہتیں اور نہ کوئی فیس لیں گی۔ لیکن ہمیں اس کے لیے کوئی مکان نہیں ملتا۔ آپ ہمیں انجمن میں کوئی کمرہ دے دیں تو ہمیں بڑی آسانی ہوگی۔ میں نے کہا اس وقت کوئی کمرہ خالی نہیں البتہ گیلری ہے صحن ہے اور گیراج ہے اس سے آپ کا کام چل سکے تو چلایئے اگر اس اثنا میں کوئی کمرہ خالی ہو گیا تو دے دیا جائے گا انھوں نے اسے قبول کر لیا اور کہا کہ ہمیں کچھ فرنیچر کی ضرورت ہوگی میں نے کہا ہمارے پاس فرنیچر نہیں ہے میں نے اور ہمارے بزرگوں نے فرش پر اور ٹاٹ پر بیٹھ کر علم حاصل کیا تم بھی ٹاٹ لے آؤ اور اس پر بیٹھ کر تعلیم دو چنانچہ وہ دوسرے روز دری لے کر آئیں اور طالبات کو تعلیم دینی شروع کی۔ اتنے میں اُن میں سے ایک خاتون میرے پاس آئیں اور کہا حکیم احسن صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم یہاں نہیں پڑھا سکتیں اور چلی جاؤ۔ میں ان کو اپنے ساتھ لے کر نیچے گیا اور دری پر بیٹھ کر تعلیم شروع کرا دی۔ حکیم صاحب چاہتے تھے کہ میں جھگڑا کروں لیکن جب میں خاموش رہا تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی اور انھوں نے ڈاکٹر محمود حسین کو ایک مراسلہ لکھا جس میں تحریر فرماتے ہیں:

''دفتر انجمن سے اطلاع ملی کہ اردو خواتین کالج کی چند طالبات دفتر انجمن میں روزانہ آتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کلاسز وہاں لی جاتی ہیں۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ غالباً کالج کو ختم ہی کر دیا گیا ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ ان طالبات کو اجازت دی گئی ہے، کہاں سے واللہ اعلم۔ بہر حال چوں کہ قانونی صورت یہ ہے کہ انجمن کی تمام تر املاک منقولہ اور غیر منقولہ از روئے آئین معتمد صاحب کی تحویل میں ہے اس لیے میں آپ کے احکامات کا منتظر ہوں کہ اس معاملے میں کیا کیا جائے اگر آپ کا حکم ہو کہ اجازت ہے تو اس کی تعمیل کی جائے گی اگر آپ کی رائے ہو کہ اجازت نہ ہونی چاہیے تو پھر اس سلسلہ میں اقدام کیا جائے۔''

اس مراسلہ کے موصول ہونے پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کیا واقعہ ہے میں نے انھیں لکھا کہ:

''تعلیم طالبات کے متعلق جو اطلاع آپ کو دی گئی ہے وہ سراسر غلط ہے اس کا اردو خواتین کالج سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اطلاع غلط پیرائے میں آپ کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔''

اصل واقعہ یہ ہے کہ چند اعلیٰ تعلیم یافتہ ہمدرد خواتین میرے پاس آئیں اور کہا کہ ہم بلا معاوضہ اور بغیر فیس کے پرائیویٹ طور پر ایسی چند طالبات کو تعلیم دینا چاہتی ہیں جو آئندہ یونی ورسٹی کے امتحانات میں پرائیویٹ طور پر شریک ہوں گی۔ ہم نہ یونی ورسٹی سے کسی امداد کے طالب ہیں نہ انجمن سے اور نہ کسی اور ادارے سے اس وقت ہماری صرف ایک مشکل ہے کہ ہمیں کوئی مناسب مکان تعلیم کے لیے دستیاب نہیں ہو سکا۔ آپ اگر ہمیں

انجمن ہال میں چار بجے سے سات بجے تک تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دیں تو ہماری یہ مشکل حل ہو جائے گی۔ مجھے ان خواتین کا ایثار، ہمت اور ہمدردی دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی بلکہ رشک آیا لیکن میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس وقت انجمن کی عمارت میں نہ کوئی ہال خالی ہے اور نہ کوئی کمرہ۔ البتہ سب سے نیچے کے حصے میں صرف ایک برامدہ اور بیچ کی ایک گیلری ہے اور گیراج اور اس کے سامنے خالی زمین۔ اگر یہاں آپ اپنی طالبات کی تعلیم کا انتظام کر سکتی ہیں تو میں اس کی اجازت دے سکتا ہوں لیکن یہ معلوم رہے کہ ہم فرنیچر وغیرہ کچھ نہیں دے سکتے۔ انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ چنانچہ اب وہ چار بجے سے سات بجے تک زمین پر بیٹھ کر اپنی طالبات کو تعلیم دیتی ہیں۔ مجھے شریک معتمد صاحب کا مراسلہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا اور شرم محسوس ہوئی کہ ایک بے چاری عورتیں ہیں کہ اپنی بہنوں کی تعلیم کے لیے ایثار کرتی ہیں اور محنت اور تکلیف برداشت کرتی ہیں۔ ایک ہم مرد ہیں کہ بلا کسی معقول وجہ کے ان کی تعلیم میں رکاوٹیں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل کراچی میں حصول تعلیم میں کیسی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں اور ناقابل برداشت گرانی اور مصارفِ تعلیم نے ان مشکلات میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ سیکڑوں طالب علم مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کو تعلیم کا موقع حاصل نہیں، ایسے کار خیر میں آسانی بہم پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ اس میں املاک کی بحث درمیان میں لانا نہ صرف غیر متعلق اور نامناسب ہے بلکہ مضحکہ خیز ہے۔

امید ہے کہ اس حقیقت حال کے معلوم ہونے پر آپ کامل طور پر مطمئن ہو جائیں گے۔

جب میری طرف سے اس میں بھی جھگڑے کی کوئی صورت نہ نکلی تو حکیم صاحب کا یہ حربہ بھی بیکار گیا۔ اب ان کی توجہ کتب خانے کی طرف منعطف ہوئی جواب تک ان کی

دست برد سے باہر تھا اور جہاں میں صبح سے شام تک بیٹھا کام کرتا رہتا تھا۔ میں انفلوئنزا میں مبتلا ہو گیا اور پھر پیچش نے آ گھیرا۔ ڈاکٹر نے زینے سے اُترنے چڑھنے کو منع کر دیا تھا اس لیے میں اس عرصے میں اوپر ہی رہا۔ کتب خانے میں جانا نہ ہو سکا یہ موقع انھیں اچھا ہاتھ لگا، علیم الظفر ٹائپسٹ کو سکھا پڑھا کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کچھ کتابیں کتب خانے سے چُرا لائے، چنانچہ ایک روز وہ آنکھ بچا کر کتب خانے میں گھس آیا اور اُس الماری کا قفل توڑنے لگا جس میں مَیں نے بعض نوادر محفوظ کر رکھے تھے۔ دوسروں کی واویلا سن کر وہ قفل نہ توڑ سکا اور ویسے ہی بھاگ کھڑا ہوا یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کچھ کتابیں کتب خانے سے اڑالی جائیں اور مجلس نظما میں پیش کر کے بیان کیا جائے کہ یہ کتابیں بازار میں بکتی ہوئی ملیں اور اس سے یہ ثابت کیا جائے کہ کتب خانے کا انتظام نہایت ناقص ہے۔ کتابوں کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اس کا انتظام صدر سے نکال کر شریک معتمد یا ایک کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔

اب ایک نئی سازش کا جال پھیلایا گیا۔ میر سرفراز علی رضوی صاحب کتب خانے کے مہتمم ہیں وہ ابتدا سے کتب خانے کی ترتیب و تنظیم میں میرے ساتھ کام کرتے رہے ہیں اور انھوں نے کتابوں اور تحریروں وغیرہ کی حفاظت بڑی احتیاط اور دیانت سے کی ہے ان کی امداد کے لیے ایک شخص صالح الدین نشتر کو بھی کتب خانے میں لگا دیا تھا۔ نشتر صاحب کو یہ پٹی پڑھائی گئی کہ وہ سرفراز علی صاحب پر یہ الزام لگاوے کہ وہ کتابیں چرا کر لے جاتے ہیں اور سکریٹری کے خلاف بغاوت پھیلاتے ہیں اور سازشی کارروائیاں کرتے ہیں یہ شکایت نشتر صاحب نے شریک معتمد صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ شریک معتمد صاحب نے سرفراز علی صاحب سے جواب طلب کیا۔ سرفراز علی صاحب نے قفل توڑنے اور دوسرے حالات بیان کر کے ان الزامات کو غلط ثابت کیا۔ شریک معتمد صاحب نے جواب ناقابل

اطمینان تصور کر کے سرفراز صاحب کو معطل کر دیا اور تحقیقات کا حکم دیا۔ بہت دنوں تک تحقیقات ہوتی رہی الزام ثابت نہ ہوا اور سرفراز صاحب کو بحال کرنا پڑا صرف ان کو مرعوب کرنا اور تکلیف پہنچانا تھا لیکن اس میں عجیب بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ غلط الزام لگانے والے سے کوئی بازپرس نہیں کی گئی۔ اس سے شریک معتمد صاحب کی ذہنیت اور نیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس تیسری مہم میں بھی ہمارے مہربان کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ مگر وہ بہت مستقل مزاج ہیں۔ ہمت نہ ہارے۔ ان ہی نشتر صاحب سے ایک تحریر لکھوائی کہ ''مولوی صاحب کتابیں خورد برد کرتے ہیں'' بعد میں نشتر صاحب نے اپنی حرکت سے پشیمان ہو کر اپنا حلفی بیان مجھے بھجوایا جو یہ ہے:

> ''صالح الدین خان نشتر بلرامی۔ میں خدا کو حاضر و ناضر سمجھ کر صاف دل سے بلا جبر و اکراہ یہ بیان دیتا ہوں کہ کتب خانہ خاص میں کتابوں کی خرد برد کے متعلق میں نے جو تحریر دی تھی وہ علیم الظفر صاحب کے کہنے اور زور دینے پر دی تھی۔ انھوں نے کہا کہ شریک معتمد صاحب کو اس قسم کی تحریر کی ضرورت ہے چوں کہ شریک معتمد صاحب دفتر کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں اور ترقی و تنزل بلکہ عزل و نصب کے اختیارات بھی استعمال کرتے ہیں لہٰذا جن حالات میں مَیں نے یہ تحریر دی تھی اس کا اندازہ سب کر سکتے ہیں۔ مجھ سے قبلہ مولوی صاحب صدر انجمن کی زبوں حالی مزید نہیں دیکھی جاتی لہٰذا میں اپنا اخلاق فرض سمجھتے ہوئے اپنے ضمیر کی آواز پر اپنا اصلی حال بے کم و کاست بیان کرتا ہوں۔ امید ہے میری یہ فروگزاشت نظر انداز کی جائے گی۔ خدا مجھے استقامت دے۔''

دستخط: صالح الدین خاں نشتر بلرامی

(یکم مئی ۱۹۵۸ء)

اس کی تصدیق علیم الظفر صاحب نے بھی کی جو حسب ذیل ہے:

''جناب عالی! اب تک میں نے چند عہدہ دارانِ انجمن کے کہنے پر جو کچھ کیا اُس کو آپ کی خدمت میں بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھ سے جو قصور انسانی کمزوریوں کی وجہ سے سرزد ہوئے ہیں انھیں آپ بزرگ ہوتے ہوئے معاف فرمائیں گے۔ مجھے انجمن اور اردو سے محبت ہے اور میں اس میں انتشار یا خرابی نہیں دیکھ سکتا کتب خانہ خاص کی پوزیشن یہ ہے کہ صالح الدین خان صاحب نشتر نے آپ کے خلاف جو یہ تحریر دی تھی کہ مولوی صاحب کتابیں خرد برد کرتے ہیں وہ بالکل غلط تھی اور میرے اور زیدی صاحب (۱) کے دباؤ ڈالنے پر دی تھی لیکن اب مجھے اس کا افسوس ہے کہ کتب خانہ اس وجہ سے بند ہوا اور آپ کو تکلیف ہوئی۔

خادم

علیم الظفر گنج ڈنڈواردی

مورخہ ۲۸/اپریل ۱۹۵۸ء

کتب خانے کے متعلق یہ چوتھی سازش بھی ناکام رہی ورنہ مجھے بدنام کرنے اور کتب خانہ نااہلوں کے ہاتھوں میں جانے کے لیے یہی کافی تھا۔ لیکن آفرین ہے ڈاکٹر محمود حسین کی دانشوری اور حریفوں کے استقلال اور ہمت پر کہ اب بھی ہار نہ مانی۔ اب وہ ایک نئی چال

---

(۱) صفی الحسن زیدی۔ حکیم محمد احسن صاحب کے خاص کارندے، جو حکیم صاحب کے ذاتی کاموں میں مصروف رہتے ہیں لیکن تنخواہ انجمن سے وصول کرتے ہیں۔

چلے۔ میر پور خاص کالج کے ایک لیکچرار کریم الدین احمد صاحب ایک روز کتب خانے میں آئے۔ میں اس وقت ذرا دیر کے لیے اوپر چلا آیا تھا۔ جب نیچے کتب خانے میں گیا تو یہ صاحب صالح الدین صاحب نشتر سے باتیں کر رہے تھے۔ اُن سے فارغ ہونے کے بعد وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں امیر مینائی پر کام کر رہا ہوں آپ سے مدد اور مشورے کا خواہاں ہوں۔ میں نے کہا یہ اچھا ادبی کام ہے اس وقت کتب خانہ بند ہونے والا ہے کل تعطیل ہے اس کے بعد آیئے، مجھ سے جو مدد بھی ممکن ہوگی اس کے دینے میں دریغ نہ کروں گا۔ جب وہ کتب خانے سے نکل کر نیچے دفتر میں گئے تو ہمارے مہربان کے گرگوں نے انھیں گھیرا ان سے ایک تحریر اس مضمون کی لکھوائی کہ میں کتب خانے میں ملنے گیا تو مولوی صاحب نے مجھے گالیاں دیں اور دھکے دے کر باہر نکال دیا، جب میرے ایک طالب علم کو جو میری نگرانی میں ریسرچ (ادبی تحقیق) کا کام کر رہے تھے یہ معلوم ہوا تو انھوں نے لکچرار صاحب کو لکھا کہ آپ نے ایسی غلط بات کیسے لکھی اور اس پر ان کو ملامت کی تو انھوں نے جواب میں جو خط ''ریسرچ اسکالر'' کو لکھا اس میں یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے:

> ''مولوی صاحب کی خدمت میں میری جانب سے یہ عرض کیجیے کہ میں نے یہ کام محض غلط فہمی کی بنا پر کیا ہے ورنہ مولوی صاحب کی میرے دل میں بڑی عزت ہے میں انھیں اپنا بزرگ بھی سمجھتا ہوں مجھے بڑی ندامت ہے کہ ایسی تحریر میرے قلم سے نکلی جس سے مولوی صاحب کو تکلیف پہنچی''۔

کریم الدین صاحب نے مجھے بھی ایک خط لکھا، جسے ذیل میں نقل کرتا ہوں:

''جناب قبلہ مولوی عبدالحق صاحب۔ تسلیمات

تہور حسین صاحب (۱) کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ
کے بعض مخالفین میری ایک تحریر کو آپ کے خلاف استعمال کرنا چاہتے
ہیں۔ اس تحریر کے متعلق دست بستہ عرض ہے کہ وہ غلط فہمی کی بنا پر دی
گئی تھی مجھے بتایا گیا تھا کہ شاید نشتر صاحب کی سرزنش کی جائے گی
اور چوں کہ اس دن لائبریری میں جانے کا ذمہ دار میں خود تھا اس
لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے کسی دوسرے شخص کو بلاوجہ
تکلیف پہنچے۔ اس تحریر میں بعض جملے آپ کی ذات کے خلاف بھی
ہیں اس لیے انتہائی نادم ہوں اور آپ سے معافی کا خواستگار ہوں
امید ہے کہ آپ اپنا خرد سمجھ کر مجھے معاف کریں گے۔ میرے دل
میں آپ کے لیے بڑی عزت ہے اس لیے میں آپ کے خلاف کچھ
تحریر کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ محض غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔ مجھے بڑا
افسوس ہے کہ میرے قلم سے غلط فہمی کی بنا پر ایسے کلمات نکلے۔ امید
ہے کہ آپ معاف کریں گے۔''

فقط

احقر کریم الدین احمد

یہ تحریر ہمارے مہربان میرے خلاف مجلس نظما میں پیش کر کے یہ قرارداد منظور
کرانے والے تھے کہ یہ شخص نہایت بداخلاق ہے استفادہ کرنے والوں سے بری طرح
پیش آتا ہے لہٰذا کتب خانہ اس کی نگرانی سے نکال کر شریک معتمد صاحب کی نگرانی میں دے
دیا جائے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ کریم الدین صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا ہے اور
معافی مانگ لی ہے تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔

---

(۱) متذکرہ ریسرچ اسکالر۔

یہ پانچواں وار بھی خالی گیا اور منہ کی کھائی۔ بے غیرتی کی انتہا ہے کہ اس کے بعد بھی وہ اپنی حرکت سے باز نہ آئے۔ مجلس نظما میں ان میں سے ایک نے تجویز پیش کی دوسرے نے تائید کی اور اکثریت کے بل پر منظور کرالیا کہ کتب خانوں کی کتابوں کی تنقیح کی جائے۔ میں نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا کیوں کہ کتب خانے میری ملک ہیں کتابوں کی تنقیح ہو جائے گی تو مجھے بھی اطمینان ہو جائے گا۔ لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ تنقیح سے پہلے ان حضرات نے سرفراز علی صاحب کو جو ایک کتاب سے واقف اور نہایت دیانتدار ہیں کتب خانے سے ہٹا کر ایک دوسرے شخص کو لا بٹھایا ہے اور تنقیح کرنے والے ایسے اشخاص تجویز کیے ہیں جو میری دانست میں بہت مشتبہ تھے، نیز اس سے قبل کتب خانے پر قبضہ کرنے کے لیے کئی حملے ہو چکے تھے وہ بھی میری نظر میں تھے۔ تو میں نے تنقیح کرانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس ترکیب سے وہ کتابوں میں ردّوبدل کر کے یا کچھ کتابیں نکال کر اپنی منشا کے موافق رپورٹ لکھواتے اور مجلس میں پیش کر کے یہ قرارداد منظور کراتے کہ موجودہ انتظام اور نگرانی نہایت ناقص اور نقصان رساں ہے لہٰذا کتب خانے شریک معتمد صاحب کی نگرانی میں دے دیے جائیں جو معتمد صاحب کے خیال میں نہایت جانب دار صلح پسند، مرنجان ومرنج، ایثار مجسم، پیکر خلوص وشرافت ہیں اس پر ان صاحبوں نے مجھے لکھا کہ آپ کے حکم کے مطابق ہم کتب خانے کو مقفل کرنا چاہتے ہیں آپ بھی اُس وقت حاضر رہیں۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا اور کسی کو کتب خانہ مقفل کرنے کا حق نہیں اور جو اس کا مرتکب ہوگا وہ نتائج کا ذمہ دار ہوگا۔ باوجود اس کے ان حضرات نے کتب خانے کو مقفل اور سربمہر کر دیا اور ۲۰ رنومبر ۱۹۵۷ء سے آج تک بند ہے میں جو کام کر رہا تھا وہ بھی اس میں بند رہ گیا اور دوسرے اصحاب جو علمی وادبی تحقیق کا کام کر رہے تھے وہ بھی محروم رہ گئے اور بعض کے مقالے جو وہ لکھ رہے تھے اور ان میں سے ایک دو

نے جو مجھے مشورے کے لیے دیے تھے وہ سب بند پڑے ہیں۔ قلمی کتابوں کی حالت بہت نازک ہوتی ہے۔ انھیں ہر روز دیکھنے صاف کرنے، ہوا دینے اور کبھی کبھی دھوپ دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ کیڑے صفحے کے صفحے چٹ کر جاتے ہیں اور کتاب آٹا ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب جب کہ کتب خانہ بند ہے ہوا کا نام نہیں اور برسات سے چھتیں ٹپک رہی ہیں اور وہ الماریاں مقفل ہیں جن میں نہایت نادر و نایاب مخطوطات ہیں جن میں بعض ایسے ہیں کہ دنیا کے کسی کتب خانے میں ان کا دوسرا نسخہ نہیں، ان کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ ان میں سے بہت سے حشرات الارض کی نظر ہو گئے ہوں گے۔ ایسی بیش بہا چیزوں کا تلف ہو جانا جو قوت، حکومت اور دولت کے زور سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتیں ایک ایسا قومی نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ ان بیش بہا صحائف کا نااہلوں اور جاہلوں کے ہاتھوں میں پڑ جانے کا نتیجہ سوا بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس بربادی سے ان کے دل پر میل تک نہیں آیا بلکہ ہمارے بعض مہربان خوش ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جناب ڈاکٹر صاحب مجھے یہ الزام دیتے ہیں کہ میں دستور اور قانون کے نام سے چڑتا ہوں (ڈاکٹر صاحب نے ''چڑھتا ہوں'' تحریر فرمایا ہے) اور جو کوئی بدعنوانیوں کا مرتکب ہوتا ہے اس کی پشت پناہی کرتا ہوں۔ کیا خوب اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ بے شک میں ایسی قراردادوں کی تعمیل نہیں کرتا جو خلاف دستور دھوکہ دے کر دھاندلی سے اکثریت کے بل پر منظور کرا لی جاتی ہیں۔ مثلاً مجلس نظما میں یہ قرارداد منظور کرا لی گئی کہ سکریٹری خازن اور صدر میں سے کسی دو کے دستخط سے بذریعہ چیک رقم وصول کی جا سکتی ہے۔ میں نے پوچھا اس کی کیا ضرورت پیش آئی تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جب آپ نہ ہوں گے تو چیک پر کون دستخط کرے گا۔ میں نے کہا اس حالت میں حسب دستور نائب صدر دستخط کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے جیسا کہ ان کی عادت ہے

بڑے زور سے کہا ''نہیں'' میں تو تو مَیں مَیں نہیں کرنا چاہتا تھا خاموش رہا۔ بینک حسب قاعدہ ان اشخاص کے دستخطوں کا نمونہ طلب کرتا ہے جن کے دستخط روپیہ وصول کرنے کے لیے چیک پر ہوتے ہیں۔ شریک معتمد صاحب نے بینک کو بھیجنے کے لیے میرے دستخط طلب کیے تو میں نے انکار کر دیا کیوں کہ قرارداد سراسر دستور انجمن کے خلاف تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کی شکایت فضلی صاحب نے بھی مجھ سے کی۔ انجمن کے دستور کی دفعہ ۱۰ حسب ذیل ہے:

''چیکوں پر عموماً صدر اور خازن دستخط کرنے کے مجاز ہوں گے خازن کی غیر موجودگی میں معتمد اور صدر کی غیر موجودگی میں صدر کا نامزد کردہ نائب صدر دستخط کرنے کے مجاز ہوں گے۔''

میں انصاف چاہتا ہوں۔ دستور کی خلاف ورزی میں نے کی یا ڈاکٹر صاحب اور ان کے حامیوں نے۔ اس قرارداد کے پاس کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خازن اور سکریٹری کے دستخطوں سے روپیہ وصول کیا جائے اور جس طرح چاہیں صرف کریں۔ صدر کو خارج کر دینے سے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ رہے گا۔ رہے معتمد صاحب تو وہ اپنے آدمی ہیں ان سے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔

حسب دستور نئی آسامی قائم کر کے تقرر کرنے کا حق مشروط طور پر صرف صدر کو حاصل ہے مگر شریک معتمد صاحب نے (جو حقیقی معتمد ہیں) بلا ضرورت اپنے مطلب کے دو ملازموں کو پونے تین سو اور ڈیڑھ سو کی تنخواہوں پر مقرر کر رکھا ہے جن کا کوئی کام نہیں۔ دستور انجمن میں صدر کے اختیارات میں ایک دفعہ یہ ہے:

''فوری ضرورت کے موقعہ پر کوئی آسامی قائم کرنے کا اختیار ہوگا لیکن نئی آسامی کی منظوری مجلس عاملہ کے آیندہ اجلاس میں حاصل

کرنی ہوگی۔''

دستور کی یہ خلاف ورزی میں نے کی ہے یا ڈاکٹر صاحب یا اُن کے شریک نے، اور انجمن کا یہ روپیہ جو بلاضرورت ضائع کیا جارہا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب سے یہ کہا تھا کہ شریک معتمد کی آسامی کی ضرورت نہیں آپ ایک آفس سیکریٹری رکھ لیجیے تو انھوں نے فرمایا تھا کہ اس کی تنخواہ کہاں سے دی جائے گی، اب ان مفت خوروں کی تنخواہ کہاں سے آتی ہے۔ جناب خازن صاحب جو پہلے انجمن کے آمدوخرچ پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے اور بات بات میں مین میخ نکالتے تھے انجمن کا روپیہ ضائع ہوتے دیکھ رہے ہیں اور کچھ نہیں کہتے۔

یوں تو حکیم محمد احسن صاحب انجمن کے ٹائپ رائٹر اور ٹائپسٹ سے اپنا ذاتی کام (انجمن کے خرچ سے) لیتے ہی رہتے ہیں، لیکن پچھلے دنوں ایک انگریزی کتاب مع اپنی ایک تحریر کے انجمن کے خرچ سے تیار کرائی گئی جس پر تخمیناً -/۲۲۸ روپے صرف ہوئے۔ حکیم صاحب نے اپنے مطب کی طرح انجمن کو بھی اپنا ذاتی ادارہ سمجھ لیا ہے۔ خیر ان کا شمار تو عام اشخاص میں ہے لیکن وہ حضرات جو مسند علم و فضل پر متمکن ہیں ان کی دیانت داری کا حال دیکھنا ہو تو کراچی یونی ورسٹی کی تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ ملاحظہ ہو اس سے ان کی دیانت کا راز آشکارا ہوگا۔ یہی حال انجمن ترقی اردو کالج کی تحقیقاتی رپورٹ کا ہے جو دبا رکھی ہے اور پیش نہیں کی جاتی۔ کیا ڈاکٹر صاحب کا یہ فرض نہ تھا کہ اسے گوشۂ راز داری سے نکال کر منظر عام پر لاتے اور خطاکاروں کی بددیانتی کا پردہ چاک کرتے۔ غرض ایں خانہ تمام آفتاب است۔

جدید انتظامات میں انجمن پریس ایک کمیٹی کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ اُس مہینے پریس کے ملازم میرے پاس آئے اور اپنی تنخواہ کا تقاضا کیا۔ میں نے کہا، پریس کا

تعلق اب مجھ سے نہیں رہا تم حکیم محمد احسن صاحب کے پاس جاؤ جو کمیٹی کے داعی ہیں۔ انھوں نے کہا ہم گئے تھے مگر حکیم صاحب نے تنخواہ دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے ان غریب ملازمین کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا میں نے کہا اس وقت روپیہ نہیں ہے۔ دو ایک روز میں سوچ کر کوئی صورت نکالوں گا، وہ تین روز تک برابر آتے رہے انھیں دیکھ کر میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا تھا اور انھیں منہ دکھانے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ آخر میں نے ایک دوست کے ذریعے ایک مہینے کے وعدے پر دو ہزار روپے قرض لیے اور تنخواہ تقسیم کر دی۔ کئی مہینے گزر گئے انجمن نے یہ روپیہ نہ دیا۔ اُدھر سے ادائے رقم کا تقاضا ہونے لگا۔ انجمن کے پاس روپیہ تھا لیکن محض اذیت پہنچانے کے لیے مجھے رقم نہیں دی گئی۔ جب تقاضا شدید ہوا تو میں نے مجبور ہو کر اپنی دو کتابوں کا حق تالیف ایک ناشر کو دے کر دو ہزار روپے وصول کیے اور قرض بے باق کیا۔

جب سے پریس کمیٹی کی تحویل میں گیا ہے اس کی حالت ابتر ہو گئی ہے۔ مجلس نظما کے پچھلے جلسے میں پریس کی جو رپورٹ پیش ہوئی وہ قابل دید ہے۔ انجمن کا پریس اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ انجمن کی کتابیں صحت اور سلیقے کے ساتھ وقت پر طبع ہوں، اس رپورٹ میں بازاری کتابوں کی فہرست دے کر اپنی کارگزاری جتائی گئی ہے انجمن کی صرف دو تین کتابیں ہیں جو کمیٹی کی تحویل میں آنے سے پہلے کی ہیں۔ البتہ انجمن کی ایک کتاب ''قاموس اردو کتب'' اب زیر طبع ہے اس کا یہ حال ہے کہ دن میں صرف ایک صفحہ کمپوز ہوتا ہے۔ بازاری کتابوں کو صرف اس لیے ترجیح دی جاتی ہے کہ اس طرح خرچ کرنے کو روپیہ ملتا ہے۔ آیندہ سال کے پروگرام میں صرف دو کتابیں رکھی گئی ہیں۔ پروفیسر حتی کی ''ملت عربی'' کا دوسرا حصہ جس کا پہلے سے ترجمہ ہو رہا ہے اور دوسری ''جیتا جاگتا'' جو دو سال پہلے تجویز کی گئی تھی۔

اس رپورٹ میں پریس کے حسابات بھی درج ہیں جو کارگزاری طباعت سے بھی

عجیب تر ہیں اس میں قرضہ کو آمدنی اور خسارے کو منافع دکھایا گیا ہے اور اس طرح ارکان مجلس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر منظوری حاصل کر لی گئی ہے۔

شریک معتمد صاحب سیاہ وسفید کے مالک بنے ہوئے ہیں معتمد بے چارے کی تو کچھ ہستی ہی نہیں ملازمین کی معطّلی، برطرفی، بحالی، شریک معتمد کے حکم سے ہوتی ہے۔ دستور انجمن کی رو سے شریک معتمد کو کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے معتمد اگر اپنا کوئی اختیار شریک معتمد کو دینا چاہے تو اسے حسب دفعہ ۱۲ صدر کی منظور حاصل کرنی لازم ہے لیکن یہاں شریک صاحب کا حکم ہی دستور ہے۔ اس پر بھی مجھے خلاف ورزی دستور کا الزام دیا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ معتمد صاحب حکیم صاحب سے اس قدر مرعوب کیوں ہیں، کہ وہ صبح سے شام تک خلاف ورزیاں اور بدعنوانیاں کرتے رہتے ہیں اور معتمد صاحب خاموش دیکھتے رہتے ہیں اس میں ضرور کوئی لم ہے۔

اب میں ایک ایسی چیز پیش کرتا ہوں۔ جو دستور قانون اور اخلاق کی رُو سے انتہائی پست اور غیر شریفانہ بلکہ مجرمانہ ہے۔ مولوی عبدالعلی خان صاحب اسسٹنٹ سکریٹری انجمن نے مجھے مندرجہ ذیل تحریر بھیجی، اور معتمد صاحب اور دوسرے ارکان انجمن کو بھی اس سے آگاہ کیا۔

جناب صدر صاحب! شریک معتمد صاحب نے مجھ سے کئی مرتبہ فرمایا کہ صدر صاحب کے نام کے خطوط میں کھول کر پڑھا کروں میں نے جواب دیا کہ یہ حکم قاعدہ اور اخلاق کے خلاف ہے میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد پرنسپل میجر آفتاب حسن صاحب نے مجھ کو بلوایا اور فرمایا کہ حکیم محمد احسن صاحب آپ کی شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مددگار معتمد صاحب میرا یہ حکم نہیں مانتے کہ مولوی عبدالحق صاحب کے نام کے خطوط کھول کر مددگار پڑھا کریں اور مجھ کو بتلائیں کہ ان میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کے

نام کے خطوط آپ پڑھا کیجیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے کئی پروفیسروں کی موجودگی میں ان کو جواب دیا کہ میں مولوی صاحب کے نام کے خطوط کبھی نہیں کھولوں گا اور نہ ان کو پڑھوں گا کیوں کہ یہ قاعدے کے بالکل خلاف ہے گورنمنٹ آف انڈیا میں جہاں میں نے بیس سال سے زیادہ کام کیا ہے بڑا افسر چھوٹوں کے خطوط نہیں کھولتا اور ان کے جن کے نام کے خطوط ہوتے ہیں بھجوا دیتا ہے۔ اس جواب پر پرنسپل صاحب بھی ناراض ہوئے۔'' اس کے بعد یہ کام علیم الظفر کے سپرد ہوا اور وہ ان کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

باوجود یہ کہ یہ سب واقعہ ڈاکٹر صاحب کے علم میں ہے لیکن انھوں نے کبھی اپنے شریک سے اس بارے میں جواب طلب نہیں کیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ان کے منشا کے مطابق ہوا۔ ورنہ کوئی شریف افسر اپنے ماتحت کی اس قسم کی کمینہ حرکت کا روادار نہیں ہوسکتا، یہ ہیں اخلاق، انجمن کے معزز معتمد اور شریک معتمد کے، جو انجمن کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ اس سے بڑھ کر انجمن کی بدنصیبی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اب معتمد صاحب فرمائیں کہ دستور اور قانون سے میں چڑتا ہوں یا وہ۔

ایک الزام جناب معتمد صاحب نے مجھ پر یہ لگایا ہے کہ انجمن کی روداد کے رجسٹر کے صفحات غائب کردیے گئے تھے تاکہ مقدمات میں کچھ فائدہ حاصل کیا جائے اور میں نے اس شخص کی تائید کی جس کی تحویل میں یہ رجسٹر تھا۔ رجسٹر میں روداد درج کی جاتی ہے تو توثیق کے لیے صدر کے دستخط لیے جاتے ہیں میرے سامنے کبھی یہ روئداد پیش نہیں ہوئی تھی، اس کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ روداد رجسٹر میں درج کی گئی تھی، اور وہ اوراق اس میں سے پھاڑ لیے گئے۔ اگر رجسٹر کے صفحات پر نمبر ہوتے تو فوراً معلوم ہوجاتا، لیکن صفحات پر نمبر نہ تھے اس لیے فریق مخالف کو اس الزام کے تراشنے میں بڑی آسانی ہوگئی۔ ان اوراق کے غائب کرنے سے مقدمات میں کسی قسم کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا جب کہ یہ روئداد فرداً فرداً

تمام ارکان مجلس نظما کے نام بھیجی گئی تھی اور موجود تھی اور آخر اسی کو رجسٹر میں لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نہ اس جلسے میں موجود تھے اور نہ انھوں نے وہ روداد دیکھی تھی۔ چوں کہ ان کے مشیر نے کہہ دیا کہ اوراق غائب کر لیے گئے لہٰذا انھوں نے بھی یہی کہنا شروع کر دیا۔ ایسا خوش عقیدہ معتمد کہاں کسی کو ملے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے استعفیٰ نامے میں مجھے صدارت سے خارج کر کے سرپرست بنانے کا ذکر فرمایا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مجلس نظما میں ایک قرارداد دستور کی ترمیم کے متعلق منظور کرائی گئی۔ اس کے بعد ایک کمیٹی ترمیمات پر غور کرنے کے لیے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کا اجلاس فضلی صاحب کے دولت کدے پر ان ہی کی صدارت میں ہوا۔ اس میں یہ طے کیا گیا کہ موجودہ صدر کو صدارت سے علاحدہ کر کے سرپرستوں کی فہرست میں ڈال دیا جائے۔ یہ اس فریق کی سازش تھی جو انجمن پر چھایا ہوا ہے۔ پہلے اس نے ایک معمولی سی تجویز ترمیم دستور کی پیش کرائی۔ اس کے بعد ایک ذیلی کمیٹی ترمیمات دستور پر غور کرنے کے لیے مقرر کی۔ کمیٹی کو سارے دستور میں صرف ایک ہی چیز قابل ترمیم نظر آئی یعنی صدارت انجمن۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ موجودہ صدر کو صدارت سے ہٹا دیا جائے تو اپنی پارٹی اور اپنی منشا کا صدر انتخاب کر لیا جائے گا۔ معتمد تو اپنا ہے ہی۔ شریک معتمد بھی اپنا ہے، خازن بھی اپنا ہے اور جب صدر بھی اپنا ہو جائے گا تو خوب من مانی کارروائیاں کریں گے اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ جب ترمیم کی قرارداد منظور ہوئی تو وہ معتمد نہ تھے، اگر ہوتے تو کیا ہوتا، وہ نام کے معتمد ہیں، ساری کارروائی ان کے پس پشت ہوتی ہے، ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے البتہ آخر میں ان سے دستخط لے لیے جاتے ہیں۔

فضلی صاحب اب اس بات پر آمادہ تھے کہ موجودہ الجھنوں اور تنازع کو رفع کر

کے ایسی صورت نکالی جائے کہ انجمن کا کام باقاعدہ چلنے لگے لیکن برابر ٹالتے رہے، آخر یہ طے ہوا کہ چودہ مارچ کو فضلی صاحب کے مکان پر ڈاکٹر محمود حسین، میں اور مسٹر فضل الرحمٰن جمع ہو کر اس کا تصفیہ کریں۔ فضلی صاحب نے فون کیا تھا کہ میرے لیے اپنی کار بھیجیں گے اُن کی کار دیر سے آئی، جب وہاں پہنچا تو ڈاکٹر محمود حسین، اور فضل الرحمٰن صاحب پہلے سے موجود تھے میں نے ان تمام بدعنوانیوں اور خرابیوں کو ایک ایک کر کے بیان کیا جو انجمن میں ہو رہی ہیں۔ دفتر کی حالت خراب ہے اور پریس کی حالت ابتر۔ علمی اور ادبی کام معطل ہے اور خلاف دستور انجمن میں غیر ضروری آسامیاں قائم کر کے اپنے آدمیوں کا تقرر بغرض پرورش کیا جاتا ہے اور انجمن کا روپیہ بے دردی سے ضائع ہو رہا ہے مجھے طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں۔ شریک معتمد ایسے احکام جاری کرتے ہیں جو خلاف دستور ہی نہیں، خلاف اخلاق و قانون بھی ہیں، جاسوسی کا بازار گرم ہے، میرے ہمدرد ملنے والوں کو میرے پاس آنے سے روکا جاتا ہے۔ پھر اُس سازش کا ذکر کیا جو مجھے صدارت سے خارج کرنے کے متعلق کی گئی تھی۔ میں نے کہا مجھے صدارت سے ہٹا کر سرپرستوں میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ سرپرست کی حیثیت سے مجھے انجمن کے نظم و نسق سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ جیسے اور چند سرپرست ہیں ویسا ہی ایک میں بھی ہو جاؤں گا۔ حادی فریق کتب خانوں وغیرہ پر قابض ہو جائے گا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے نوٹس دیا جائے گا کہ انجمن کے جن دو کمروں میں تم رہتے ہو وہ خالی کر دیے جائیں۔ انجمن کو ان کی ضرورت ہے۔ یہ سن کر دونوں ڈاکٹر محمود حسین اور فضلی صاحب اچھل پڑے کہ ہرگز ایسی کوئی تجویز منظور نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ اگرچہ کمیٹی کی کارروائی راز میں رکھی گئی ہے لیکن مجھے باوثوق ذریعے سے معلوم ہوا کہ ایسی تجویز منظور کی گئی ہے، لیکن یہ دونوں انکار کرتے رہے۔ مسٹر فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر محمود حسین رخصت ہو گئے تو فضلی صاحب نے تسلیم کیا کہ صدارت سے خارج کرنے

کے متعلق ضرور تجویز منظور کی گئی۔ لیکن انجمن کے کمروں کے خالی کرنے کے متعلق کوئی تجویز نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ جیسے ہوشیار شخص ایسی تجویز کیوں پیش کرنے لگے۔ آپ صاحبوں نے صرف شہد لگا دیا ہے۔ جب مجھے سرپرستوں کی فہرست میں ڈال دیا تو اس ذیل میں صرف کمروں کا خالی کرانا تو کیا اور بہت سی ایسی علتیں پیدا کی جائیں گی۔ اس کارروائی کا علم کمیٹی کے تین چار ارکان کے سوا کسی کو نہ ہوا۔ چاہیے یہ تھا کہ وہ کمیٹی کی روئداد تمام ارکان مجلس کو بھیجتے تا کہ ان کو غور کرنے کا موقع ملتا، یہ نہیں کیا گیا۔

جب میں نے ان تینوں صاحبوں کے سامنے انجمن کی بدعنوانیوں اور خرابیوں کا ذکر کیا (جس کے ثبوت میں ضروری کاغذات لے کر گیا تھا) تو وہ سب کچھ سنتے رہے کسی امر کی تردید کی اور نہ کسی بات سے انکار کیا۔ انکار کیا تو ذیلی کمیٹی کی تجویز سے اور یہ انکار سراسر غلط تھا۔ تقیہ ایسے موقع پر ہی کام آتا ہے۔

دوسرے دن میں مسٹر فضل الرحمٰن سے ملا اور میں نے کہا کہ جب تک انجمن پریس اور کالج کی بدعنوانیوں اور خرابیوں کی تحقیقات ایک بے لاگ کمیشن کے ذریعے نہ ہوگی اس وقت تک میں ٹرسٹ کے لیے رضامند نہ ہوں گا۔ اس تحقیقات کے بعد میں ٹرسٹ کی تجویز سے بخوشی اتفاق کروں گا۔ تحقیقات کے لیے یہ لوگ آمادہ نہ تھے۔ کیوں کہ ٹرسٹ قائم کرنے کا ایک مقصد تمام خرابیوں، بدعنوانیوں، روپے کے بے جا مصارف و اسراف وغیرہ پر پردہ ڈالنا بھی تھا تحقیقات میں یہ سارے راز کھلتے اور ان بداعمالیوں کے مرتکب انجمن اور کالج میں نہیں، کہیں اور ہوتے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے ریاست حیدرآباد دکن کی طرف سے تحقیقات کے ایک واقعے کو ایسے غلط رنگ میں پیش کیا ہے جو کذب بیانی کی حد تک جا پہنچا ہے، خود اصل حقیقت سے ناواقف ہیں۔ مشیروں نے جو سبق پڑھا دیا وہ انھوں نے دُہرا دیا۔ لہٰذا

میں اصل واقعہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

ریاست جے پور مغلیہ سلطنت کی بڑی وفادار تھی اور اکثر امور میں شاہان مغلیہ کی پیروی کرتی تھی۔ ریاست کی سرکاری زبان فارسی چلی آتی تھی۔ جب فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تو وہاں کی سرکاری زبان بھی اردو ہوگئی اور جے پور اردو شاعروں اور ادیبوں کا مرکز بن گیا جس زمانے میں اردو ہندی کا تنازعہ زوروں پر تھا، پنڈت مالویہ ایک وفد لے کر متوفی مہاراجا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ ریاست کی سرکاری زبان اردو کی بجائے ہندی کر دیں۔ مہاراجا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ پہلے سرکاری زبان فارسی تھی، اب ایک مدت سے اردو چلی آ رہی ہے۔ اب اس کا بلاوجہ بدلنا ہم اپنی وضع داری کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چند سال بعد مہاراجا لندن تشریف لے گئے وہاں سے واپسی پر جب بمبئی پہنچے تو ہندوؤں کا پھر ایک وفد اسی غرض سے حاضر ہوا، مہاراجا نے ان کی درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ مہاراجا کے انتقال کے بعد چوں کہ اُن کے جانشین نابالغ تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے مسٹر گلانسی ریجنٹ مقرر ہوئے۔ ہندی والوں کو وفد اُن کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اور اسی درخواست کا اعادہ کیا۔ مسٹر گلانسی نے کہا مہاراجا نابالغ ہیں مجھے یہ حق نہیں کہ یہ اس قسم کی اہم تبدیلی کروں۔ جب مہاراج بالغ اور صاحب اختیار ہوں گے تو وہ اس قسم کی تبدیلی کر سکتے ہیں۔ مہاراجا کے گدی نشین ہونے کے بعد ایک ہندو صاحب (جن کا نام اس وقت بھولتا ہوں) وزیراعظم ہوئے۔ ہندی والے اس مرتبہ پھر وفد لے کر پہنچے، مگر وزیراعظم نے صاف انکار کر دیا۔ اُس کے بعد سر مرزا اسمٰعیل ریاست کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے، جو کام متوفی مہاراجا نہ کر سکے، جو ریاست کے ریجنٹ گلانسی سے نہ ہو سکا۔ جس کے کرنے سے ہندو وزیراعظم نے انکار کر دیا وہ ہمارے مرزا صاحب کے دست مبارک سے بلا تامل انجام پا گیا۔ یعنی صاحب موصوف

نے اردو کی بجائے ہندی سرکاری زبان کردی۔ میں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ مضامین لکھے اور ایک پمفلٹ لکھا جس میں جے پور کی سرکاری زبانوں (فارسی، اردو) اور جے پور کی اردو سرپرستی اور اردو کی مقبولیت وغیرہ کے حالات تفصیل سے بیان کیے تھے۔ اول مرزا صاحب نے ہندوؤں کے اصرار پر ہندی کے بتدریج رائج کرنے کا حکم دیا تھا وہ حکم سرکاری مطبع میں چھپنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ ہندوؤں کو جب معلوم ہوا تو اس قدر واویلا مچایا کہ مرزا صاحب مجبور ہو گئے اور ان کے حکم سے یہ چھپے ہوئے تمام کاغذات نذرآتش کردیے گئے، اتفاق سے اس کا ایک پرچہ مجھ تک پہنچ گیا۔ اس کا بلاک بھی میں نے اس پمفلٹ میں دے دیا ایک صاحب بھی ان کی طرف سے میرے پاس آئے اور مجھ سے کہنے لگے آپ کیا چاہتے ہیں، میں نے کہا میں کچھ نہیں چاہتا سوا اس کے کہ اردو کی جو حیثیت پہلے تھی وہ برقرار رکھی جائے ان کا اس سوال سے مطلب کچھ اور تھا۔ میرا جواب سن کر انھیں کچھ مایوسی ہوئی اور سلسلہ کلام ختم ہوگیا۔ آخر میں مَیں نے مرزا صاحب کو لکھا کہ علی گڑھ اردو کانفرنس فلاں تاریخ کو ہونے والی ہے مناسب ہوگا کہ آپ اپنے حکم میں ضروری ترمیم فرمادیں اس وقت تک اگر کوئی جواب آپ کی طرف سے نہ ملا تو مجبوراً کانفرنس میں اس کے خلاف قرارداد پیش کرنی پڑے گی میں نے آخروقت تک انتظار کیا، کوئی جواب نہ آیا اور کانفرنس میں قرارداد پیش کرنی پڑی۔ اس تاریخ کے کئی روز بعد ان کا مراسلہ وصول ہوا۔ حکم میں کوئی ترمیم نہیں کی تھی، بلکہ اپنے پہلے حکم کے الفاظ آگے پیچھے کردیے تھے۔ اب مرزا صاحب سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ اگر عبدالحق میری مخالفت سے باز نہ آیا تو میں حضور نظام سے کہہ کر انجمن کی گرانٹ بند کرادوں گا۔ سو، اتفاق سے کچھ دنوں بعد مرزا صاحب ریاست حیدرآباد دکن کے صدراعظم ہو گئے۔ ان کی آرزو برآئی۔ حیدرآباد پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ انجمن کی مسل طلب کی اور اس کی امداد بند کرادی اور انجمن کے

حالات وحسابات کی تحقیقات کا حکم فرمایا اور محکمہ فنانس کو لکھا کہ اپنے کسی افسر کو اس کام کے لیے متعین کیا جائے۔ وزیر فنانس نے ایک قابل افسر کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ اردو کے ایک فدائی نے چپکے سے مرزا صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ یہ شخص جو انتخاب کیا گیا ہے یو پی کا رہنے والا ہے اس کا بھیجنا مناسب نہیں کسی دکنی شخص کا انتخاب کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایسے کٹر خاندان کے ایک فرد کا انتخاب کیا گیا جس نے عمر بھر ہندوستانیوں کی مخالفت کی تھی۔ اردو کے ''ہمدردوں اور شیدائیوں'' نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور مرزا صاحب سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیں اور میرے اور انجمن کے خلاف خوب خوب مضامین لکھے۔

جو صاحب تحقیقات کے لیے متعین کیے گئے تھے وہ تشریف لائے اور ایک مہینے تک ایک ایک رجسٹر، ایک ایک کتاب اور ایک ایک کاغذ دیکھتے رہے اور دوسرے حالات کی تفتیش کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے رپورٹ تیار کر کے گورنمنٹ میں پیش کر دی۔ گورنمنٹ نے اس پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر کیا۔ اس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر محمود حسین صاحب کے چچا غلام اکبر صاحب (نواب اکبر یار جنگ مرحوم) سابق جج ہائی کورٹ تھے۔ اکبر یار جنگ بہادر نے جب اس رپورٹ کو پڑھا تو انھیں نہات تعجب اور افسوس ہوا کہ اس قسم کے لغو اور مہمل اعتراض کیے ہیں اور انھوں نے اس رپورٹ پر بڑی سخت نکتہ چینی کی۔ اس کمیٹی کے کئی جلسے ہوئے اور رپورٹ رَد کر دی گئی۔ اہل حیدرآباد نے بھی اس کے خلاف جلسے کیے اور اس حرکت پر لعنت ملامت کی۔ میں نے اس رپورٹ اور تحقیقات کے متعلق ایک لفظ بھی انجمن کے اخبار ''ہماری زبان'' یا کسی دوسرے اخبار میں نہ لکھا۔ حالانکہ مرزا صاحب کے کاسہ لیس برابر میرے اور انجمن کے خلاف مضامین لکھتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ''تحقیقاتی کمیٹی کا فیصلہ کیا گیا تو اسے اردو دشمنی پر محمول

کیا گیا ہے یہاں تک کہ اسلام خطرے میں آ گیا'' اور مجھ پر بلیک میل کا الزام لگایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کیسی مضحکہ خیز بات لکھی ہے۔ بھلا اس معاملہ کو ''اسلام خطرے میں'' سے کیا تعلق؟ ڈاکٹر صاحب سیاست میں بھی رہے ہیں اور اس قسم کے نعرے جو سیاسی لوگ لگایا کرتے ہیں، اب تک ان کے دماغ میں گونج رہے ہیں۔ برائی کرنے کے لیے بھی سلیقہ درکار ہے ''عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیے'' نادان اس بھونڈے طریقے سے برائی کرتا ہے کہ وہ خود اس کے حق میں برائی ہو جاتی ہے اور اس کی نیت اور سرشت کا بھانڈا پھوڑ دیتی ہے۔ نادانی بھی عجیب چیز ہے، انگریزی میں جو یہ مثل ہے Ignorance is a bliss وہ غلط نہیں۔ نادان میں بڑی جسارت ہوتی ہے، بے سوچے سمجھے بڑھ بڑھ کے قدم مارتا ہے اور جو چاہتا ہے کر بیٹھتا ہے۔ دانا پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور کوئی کام بے سوچے سمجھے نہیں کرتا۔ ڈاکٹر صاحب کو کوئی بات تو سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے تھی۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ ہاشمی صاحب مجھے زہر دینا چاہتے تھے، اور اسی مراسلے میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''بڑی توقعات کے ساتھ یہ مہم چلائی گئی اور خاص طور پر یہ کہا گیا کہ بعض لوگ جناب صدر کی جان لینا چاہتے ہیں'' یہ مہم ڈاکٹر صاحب کے عزیز مشیروں نے چلائی ہوگی تا کہ لوگوں پر اثر ڈالا جائے البتہ یہ ضرور ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے شریک اور مشیروں نے ایسی چھچھوری اور کمینہ حرکات کیں، اور ایسی اذیتیں پہنچائیں جو جان لینے سے کم نہ تھیں اور اس کا ڈاکٹر صاحب کو بخوبی علم ہے۔ ایک دو باتوں کا اشارہ کر چکا ہوں، بخوف طوالت ان سب باتوں کا ذکر نہیں کر سکتا۔ جو ان حضرات شرافت مآب کی جانب سے عمل میں آئیں، ضرورت ہوئی تو اس کی تفصیل بھی عرض کی جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ''پھر بعض پالیسی کے معاملات بھی تھے جن کے بارے میں مجھے شکوک تھے۔ میری نظر میں پرانے دیوان اور دوسری کتابیں شائع کرنا اتنی اہم

خدمت نہ تھی جتنی کہ پاکستان کے ایسے لوگوں کو اردو سکھانا جن کی مادری زبان اردو نہ تھی۔"

بہتر ہوتا کہ اگر یہ لکھتے وقت ڈاکٹر صاحب انجمن کے اغراض و مقاصد پر نظر ڈال لیتے مگر انھیں کسی امر کے دریافت یا تحقیق سے کیا غرض، شریک یا مشیر کا کہنا ان کے لیے کافی ہے، میں ایسے لوگوں کو اردو سکھانے کی ضرورت کو ڈاکٹر صاحب سے زیادہ سمجھتا ہوں اور میں نے یہ کام بہت کیا ہے اور ایسے وسیع پیمانے پر کیا، جو کسی شخص اور ادارے نے نہیں کیا تھا۔ ان علاقوں میں جہاں کی زبان اردو نہیں مثلاً ملیبار، چھوٹا ناگپور، صوبہ مدراس کے دُور دَراز مقامات اور سی پی میں سیکڑوں مدرسے قائم کیے اور ہزار ہا مسلمان، ہندو، اچھوت، عیسائی لڑکے لڑکیوں اور بالغوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھا دیا اور اب بھی ہماری بعض شاخیں یہ کام کر رہی ہیں۔ لیکن پرانے دیوانوں اور کتابوں کا حقارت سے ذکر کر کے ڈاکٹر صاحب نے اپنی پروفیسری کو داغ دار کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ انجمن کا سب سے عظیم القدر اور امتیازی کام وہی ہے جسے وہ حقیر سمجھتے ہیں۔ اردو زبان و ادب پر انجمن کا بہت بڑا احسان ہے۔ انجمن نے انتہائی تلاش اور غیر معمولی محنت سے اردو کے ان قدیم جواہر پاروں کو چھاپ کر شائع کیا جو گمنام اور بے نام ونشان تھے۔ ان کی وجہ سے اردو زبان کی عمر دو سو سال بڑھ گئی اور اردو ادب کی تاریخ میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اردو زبان لسانیات اور اردو ادب پر لکھنے والے بغیر ان مطبوعات کے مطالعے اور حوالے کے قلم نہیں اٹھا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کی خبر نہیں کہ اردو زبان اب وہ نہیں جو پہلے تھی۔ اب بھارت اور پاکستان کی یونی ورسٹیوں ہی میں نہیں بلکہ جاپان، روس، مصر، ایران، ترکی، ملایا وغیرہ ممالک کی یونی ورسٹیوں میں بھی اردو کی تعلیم ہوتی ہے اور ہر سال یونی ورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں۔ جن پر پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ ریسرچ کرنے والے قدیم کتابوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں جو انجمن نے شائع کی ہیں۔

ابھی ایسے نایاب مخطوطات میرے کتب خانے میں موجود ہیں جو سرمائے کی کمی کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکے۔ ان کے متعلق بار بار پاکستان اور دوسری یونی ورسٹیوں کے اساتذہ کی طرف سے استفسار ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ جملے دیکھ کر جو انھوں نے اپنے الزام نامے میں لکھے ہیں حیرت ہوتی ہے۔ جب ہمارے پروفیسروں کی جہالت کا یہ حال ہے تو ان بے چارے طالب علموں کا کیا حال ہوگا جو ایسے پروفیسروں سے استفادہ کرنے کے لیے یونی ورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی عمر عزیز اور اپنے والدین کا روپیہ اس تعلیم کی نذر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تقریباً ڈیڑھ سال سے انجمن کے سکریٹری ہیں روپیہ ان کے ہاتھ میں ہے، پریس ان کے قبضے میں ہے عملہ سب ان کا فرمانبردار ہے شریک معتمد، خازن اور مجلس نظما کے اکثر ارکان ان کے اپنے ہیں ایک چھوٹا موٹا کام ہی کر دکھاتے جو ہمارے لیے نمونے کا کام دیتا۔ جھوٹا پروپیگنڈا کرنا، کذب وافترا پھیلا کر کام کرنے والوں کو بدنام کرنا آسان ہے، کام کرنا مشکل ہے، بہت مشکل ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ میں اردو کی خدمت کرنے والوں اور اداروں سے وہ سلوک روا رکھتا ہوں۔ ''جو کوئی عورت اپنی سوکن کے ساتھ کرتی ہے۔ انجمن اردو کی ترقی کی ٹھیکیدار نہیں تھی اس کو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ دوسرے ادارے بھی اردو کی ترقی میں کوشاں ہیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ کسی ادارے کو نجی یا سرکاری مدد ملی اور جسم میں آگ لگ گئی۔'' یہ بھی ڈاکٹر صاحب کا ''حسن ظن'' ہے۔ ناواقفیت بھی عجیب چیز ہے، بعض اشخاص میں سوچنے اور تحقیق کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، جو چاہتے ہیں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ صرف اپنے مشیروں پر تکیہ نہ کرتے اور دریافت کرنے کی زحمت فرماتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ میں نے اور انجمن نے کتنی انجمنوں اور اداروں کے ساتھ تعاون کیا، ان کے قیام پر

مسرت کا اظہار کیا اور ان کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کی، صرف مشہور اداروں اور انجمنوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ابتدائے قیام سے اب تک رہا اور لکھنؤ، حیدرآباد، کراچی میں اس کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت کی، شعبہ اردو ہندوستانی اکیڈیمی کا مستقل ممبر تھا اور اس کے اجلاسوں میں مضمون پڑھے اور ایک بار اس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی ہندوستانی کمیٹی بہار کا ممبر تھا اور اس کمیٹی کی درخواست پر ہندوستانی زبان کی ڈکشنری تیار کر کے دی، جس پر مجھے مسلسل دو سال محنت کرنی پڑی۔ روح ادب الہ آباد کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا اور اس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی اور مقالہ پڑھا۔ شعبہ اردو آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کی دو بار صدارت کی۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے یوم اردو کی کئی بار صدارت کی اردو کانگریس حیدرآباد دکن کے جلسے میں یہ جانتے ہوئے کہ انجمن ترقی اردو کے جواب میں اس کی اہمیت گھٹانے کے لیے بنائی گئی ہے شریک رہا، ایک مقالہ پڑھا اور صدارت کے لیے سر تیج بہادر سپرو کا نام پیش کیا۔ مجلس ادب لاہور کے قیام میں مدد دی اور سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ نوجوانانِ بنگلور نے اپنی مسلم ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی طرف سے دعوت دی۔ ان کے جلسے میں تقریر کی، ان کی ہمت افزائی کی اور مناسب مشورے دیے۔ کوئی مہینہ ایسا جاتا ہوگا کہ مختلف ادارے اور افراد مجھ سے ادبی اور لسانی امور میں مشورہ نہ کرتے ہوں۔ مجھے التزاماً ان کے استفسارات کے جواب دینے ہوتے ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب نے جامعہ ملیہ (ملیر) میں کیا کیا ان کے کالج میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے ان کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ انجمن کے کالج کی طرح ذریعہ تعلیم انگریزی کی بجائے اردو کر دیتے۔

نہ معلوم ڈاکٹر صاحب کو اس کا علم ہے یا نہیں کہ جب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی حالت نہایت سقیم ہو گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ اگر جلد خبر نہ لی گئی تو یہ بنی بنائی عمارت زمین پر

آ رہے گی۔ ایسے دو موقع آئے اور ان دونوں موقعوں پر میں نے اسے تباہی سے بچالیا۔ یہ داستان بہت طویل ہے، مختصر طور پر عرض کرتا ہوں۔ جامعہ کا ایک وفد جو ڈاکٹر انصاری مرحوم عبدالمجید خواجہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین پر مشتمل تھا۔ پہلے اورنگ آباد آیا وہاں ان کے لیے کئی ہزار کا چندہ کیا گیا۔ وفد کا اصل مقصد نظام گورنمنٹ سے مستقل امداد حاصل کرنی تھی۔ ان صاحبوں نے مجھے حیدرآباد اپنے ساتھ لے جانا چاہا، میں حیدرآباد نہیں جانا چاہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب مجھے پنشن کا حق ہو گیا تو میں نے خدمت سے سبکدوش ہونے کی درخواست دے دی۔ تین سال تک برابر پنشن کے کاغذات بھیجتا رہا اور ہر سال بجائے پنشن کی منظوری کے، ملازمت میں توسیع ہوتی رہی۔ آخر تنگ آ کر میں نے گورنمنٹ کو لکھ بھیجا کہ فلاں تاریخ کو چارج دے کر الگ ہو جاؤں گا۔ جواب میں تار آیا کہ جواب کا انتظار کیا جائے اس کے بعد ہی حکم نامہ وصول ہوا۔ جس میں پنشن کی منظوری کے ساتھ ہی ساتھ یونی ورسٹی کی پروفیسری کا تقرر بھی تھا میں اب ملازمت میں منسلک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ ڈر تھا کہ اگر حیدرآباد گیا تو پکڑا جاؤں گا۔ ارباب وفد کا اصرار تھا کہ تمھیں چلنا پڑے گا تمھارے بغیر ہمیں کامیابی نہ ہوگی۔ ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھائی سے ایسے تعلقات تھے کہ مجھے انکار کی ہمت نہ ہوئی، حیدرآباد پہنچ کر میں نے مہاراجا سر کشن پرشاد یمین السلطنت صدر اعظم کی خدمت میں وفد کے آنے کی اطلاع کی، انھوں نے ازراہ کرم وفد کو ڈنر دیا۔ ڈنر کے بعد مجھ سے فرمایا۔ تم نے ہماری بات نہیں مانی، ہم بھی تمھاری بات نہیں مانیں گے، اگر تم یہاں آنا قبول کرتے ہو تو ہم مدد دیں گے میں نے کہا سوچ کر عرض کروں گا۔ جامعہ کا معاملہ تھا میں نے حیدرآباد آنا ایک شرط کے ساتھ قبول کر لیا، شرط یہ تھی کہ اردو لغات کی تالیف و تدوین کے لیے امداد فرمائی جائے تو کوئی عذر نہ ہوگا۔ مہاراجا بہادر نے یہ شرط منظور فرمالی، ارباب وفد نے اب وزرا اور حکام سے ملاقاتیں کیں اور امداد کے لیے زمین ہموار کی۔

ڈاکٹر انصاری اور خواجہ صاحب تو واپس چلے گئے، ڈاکٹر ذاکر حسین پیروی کے لیے رہ گئے۔

ایک روز ڈاکٹر صاحب نہایت پریشان اور گھبرائے ہوئے آئے۔ میں اس وقت ملیریا میں مبتلا تھا اور بخار ۱۰۲ سینٹی گریڈ تھا، انھوں نے کہا غضب ہو گیا۔ سر اکبر حیدری (جو وزیر فنانس تھے) امداد کے خلاف ہیں۔ لِلّٰہ چلیے اور انھیں سمجھائیے، میں نے کہا پریشانی کی کوئی بات نہیں، اس وقت میں بخار میں پڑا ہوں، اچھا ہو جاؤں تو ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ انھوں نے کہا کہ یہ معاملہ آج ہی کونسل میں پیش ہونے والا ہے، اگر آپ نے اس وقت دستگیری نہ فرمائی تو جامعہ کا خاتمہ ہے۔ یہ سنتے ہی رضائی اوڑھ سر اکبر کے ہاں پہنچا وہ دیکھ کر خفا ہوئے کہ ایسی حالت میں آنے کی کیا ضرورت تھی، میں نے کہا ایسی ہی ضرورت تھی جو آیا ہوں۔ اس کے بعد اصل مدعا عرض کیا۔ سر اکبر نے فرمایا کہ میں ابھی دلّی سے آیا ہوں۔ جامعہ کا سب حال معلوم کر چکا ہوں۔ یہ سب ڈھونگ ہے وغیرہ وغیرہ میں نے اصل واقعات بتائے اور حالات کا نشیب و فراز سمجھایا۔ غرض کچھ دیر بحث کے بعد اس بات پر رضامند ہو گئے کہ پچاس ہزار یک مشت اور ہزار روپیہ ماہانہ امداد دی جائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین میرا انتظار کر رہے تھے یہ سنتے ہی باغ باغ ہو گئے۔ امداد جاری ہو گئی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو یہ ناگوار ہوا۔ چیف کمشنر دہلی نے اس کی مسدودی کے لیے نظام گورنمنٹ کو لکھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مجھے تار سے اطلاع دی۔ میں نے فوراً اکاؤنٹنٹ جنرل سے مل کر اجرا امداد کی تحریر بینک کے نام لکھوالی اور بینک میں جا کر رقم دلّی بھجوا دی۔ اس کے بعد مسدودی کا حکم محکمہ متعلقہ کے نام پہنچا۔ مگر تیر کماں سے نکل چکا تھا۔ اُس وقت تو بات ٹل گئی، آیندہ کا خدشہ باقی تھا۔ چیف کمشنر درپے تھا۔ اس لیے امداد کا مسدود ہو جانا یقینی تھا۔ میں نے سر اکبر کو سمجھایا کہ یہ چیف کمشنر بیشک جامعہ کا مخالف ہے، مگر اس کا تبادلہ ہونے والا ہے اور دوسرا چیف کمشنر جو آ رہا ہے جامعہ کا ہمدرد ہے آپ امداد بند نہ

کریں۔ یہ بات کارگر ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے شکریے میں مجھے بہت درد بھرے خط لکھے۔

ایک شکایت اس مقدمہ کے متعلق ہے جو انجمن کے خلاف دائر ہے یہ بھی ان اصحاب کی عقلمندی کا نتیجہ ہے جن کے ہاتھ میں آج کل انجمن ہے، لاکھوں کے غبن کا پروپیگنڈا زور وشور سے کیا جارہا تھا۔ آخر میں نے ان صاحبوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا آڈیٹر لاکر حسابات کی تنقیح کرالیں، حالانکہ اس سے قبل تنقیح ہوچکی تھی۔ آڈیٹر صاحب خاص غرض سے مقرر کیے گئے، لاکھوں کا غبن گھٹتے گھٹتے دو ہزار پر آکر ٹھہرا۔ یہ رقم پریس منیجر کے خلاف نکالی گئی۔ جب یہ رپورٹ پیش ہوئی تو ارکان مجلس نے منیجر کو معطل کرنے کی تجویز کی۔ میں نے کہا پہلے ان کا جواب طلب کیا جائے۔ اگر جواب ناکافی ہو تو جو کارروائی مناسب ہو کی جائے۔ اس پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منیجر صاحب نے غلط الزامات کی بنا پر ہتک عزت کی نالش کردی۔ اگر میری تجویز پر عمل کیا جاتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے مشیر اس وہم میں مبتلا ہیں کہ میں صدارت سے چمٹا ہوا ہوں اور کسی حال میں اُسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے صدارت کی نہ پہلے ہوس تھی نہ اب ہے۔ صدارت زبردستی مجھ پر تھوپی گئی تھی۔ میں ہرگز رضامند نہ تھا، مگر مجلس نظما نے رفع شر کے خیال سے اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا۔ وہ کیا واقعہ تھا جو اس کا باعث ہوا۔ اس کا بیان کرنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ کچھ عرصے بعد میں نے صدارت کے لیے سردار عبدالرب نشتر مرحوم کا نام پیش کیا لیکن ان حضرات نے جو اب انجمن پر چھائے ہوئے ہیں، میری تجویز نہ چلنے دی، اس وقت میں صدارت سے اسی لیے الگ نہیں ہونا چاہتا، کہ اگر انجمن نااہلوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو برباد ہوجائے گی۔

ایک الزام ڈاکٹر صاحب نے یہ لگایا ہے کہ اردو بنگالی کے قضیے میں بہت سے

بنگالی بھائیوں کو جو نہ صرف یہ کہ اردو کے بدخواہ نہ تھے اپنے رویے سے مخالف بنایا گیا تھا۔

یہ مجھ پر بہتان ہے، میں نے کبھی کسی علاقائی زبان کے خلاف اپنی تحریروں یا تقریروں میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بلکہ ہمیشہ یہ کہا کہ ان کو بڑھنے اور ترقی کرنے کا پورا حق ہے۔ البتہ اردو زبان کی حمایت میں سالہا سال سے کر رہا ہوں اور مجھے اس بات کے کہنے میں مطلق باک نہیں کہ اردو ہی ہماری سرکاری اور قومی زبان ہوسکتی ہے اور کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی اور یہ دعویٰ بے دلیل نہیں، بلکہ اس کی پشت پر نہایت قوی اور ناقابلِ تردید دلائل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ بہت سے بنگالیوں کو اردو کا مخالف بنا دیا سراسر غلط ہے۔ بنگالی اکابر اور ادیبوں نے انجمن کے رسالے میں نہایت پرزور مضامین اردو کی حمایت میں لکھے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کتاب کی صورت میں شائع کیے گئے۔ اگر وہ میری تحریک اور اردو کی تبلیغ سے ناخوش ہوتے تو وہ ایسے مضامین لکھنے کی زحمت کیوں گوارا کرتے۔

میں مخالفوں سے مرعوب ہو کر سچ کہنے سے کبھی باز نہیں رہا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی طرح اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ہوا کا رخ دیکھتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جو کرسی وزارت پر فائز تھے تو انھوں نے سیاست کا رنگ دیکھ کر بنگالی کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ مگر باوجود اس خوشامد اور ابن الوقتی کے وہ اپنی وزارت نہ بچا سکے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے دعا فرمائی ہے، ''خدا اردو کو اس کے دوستوں سے بچائے۔'' ڈاکٹر صاحب نے ایک پامال، فرسودہ فقرہ لکھ کر اپنی جدّتِ طبع کا اظہار فرمایا ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا شمار اردو کے دوستوں میں ہے یا دشمنوں میں۔

عبدالحق

۹ رجولائی ۱۹۵۸ء

بابائے اردو ایک نظر میں

نام:	عبدالحق	
والد کا نام:	شیخ علی حسین	
بڑے بھائی کا نام:	شیخ ضیا الحق	
چھوٹے بھائی کا نام:	شیخ احمد حسن	
تاریخ اور جائے پیدائش:	۲۰/اگست ۱۸۷۰ء ہاپوڑ، یوپی	
انٹرینس کا امتحان:	مدرسۃ العلوم علی گڑھ	۱۸۹۱ء
بی۔اے	ایم اے او کالج علی گڑھ	۱۸۹۵ء
اعزازی ڈگری	ڈی لٹ، الہ آباد یونی ورسٹی	۱۹۳۷ء
	ڈی لٹ، علی گڑھ یونی ورسٹی	۱۹۳۱ء
صدر مدرس اور مدیر رسالہ ''افسر''		۱۸۹۹ء
صدر مہتمم تعلیمات اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری		۱۹۱۲ء
ناظم، دارالترجمہ حیدر آباد (دکن)		۱۹۱۷ء
سہ ماہی مجلہ ''اردو'' کا اجرا		۱۹۲۱ء
اورنگ آباد کالج کے پرنسپل		۱۹۲۴ء
جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر		۱۹۳۰ء
انجمن ترقی اردو کے دفتر کی دہلی منتقلی		۱۹۳۸ء
انجمن ترقی اردو کے ترجمان ''ہماری زبان'' کا دہلی سے اجرا		۱۹۳۹ء
کراچی میں انجمن ترقی اردو پاکستان کا قیام		۱۹۴۸ء
پندرہ روزہ ''قومی زبان'' کا اجرا		جون ۱۹۴۸ء
اردو کالجوں کا قیام		۱۹۴۹ء-۱۹۵۰ء
حکومت پاکستان کے تشکیل کردہ اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کے بانی اور اولین مدیر اعلیٰ		۱۹۵۹ء
وفات (کراچی میں)		۱۶/اگست ۱۹۶۱ء